# ہمارے دینی علوم

علامہ اسلم جیراج پوری

دوست ایسوسی ایٹس
ناشران وتاجران کتب
الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
Phone : 7122981 Fax : 092-42-7122981

جملہ حقوق محفوظ

محمد شاہد عادل نے
زاہد بشیر پرنٹرز سے چھپوا کر
دوست ایسوسی ایٹس، اردو بازار
لاہور سے شائع کی۔
قیمت -/70 روپے

# فہرست


پیش رس ____ 4

علم تفسیر ____ 9

تفسیر بالروایت ____ 44

علم حدیث ____ 61

حقیقت حدیث ____ 104

علم فقہ ____ 125

# پیش رس

یہ کتاب حضرت مولانا اسلم جیراجپوری مدظلہ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً البلاغ' البیان وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے یا بعض علمی مجالس میں پڑھے گئے۔ اس کا ہر مضمون اپنی مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔سب سے پہلے ہمارے سامنے ''علم تفسیر'' آتا ہے' اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ایک سینما ہال میں بیٹھا ہے اور اس کے سامنے سے مفسرین کرام کے مختلف گروہ اپنے مختلف تفسیری رجحانات اور اپنے اپنے زمانے کی فکری خصوصیات کو واضح کرتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ہر زمانے کی تفسیری مساعی کو ایک شو سمجھ لیجئے شو کے ختم ہونے پر مولانا موصوف تشریف لاتے ہیں اور اس پر ایک نہایت متین تنقید فرماتے ہیں۔ اس طرح یہ سلسلۃ الذہب اپنی آخری منزل پر جا پہنچتا ہے۔

علم تفسیر کا ایک ذہین طالب علم اپنی عمر کا کافی حصہ خرچ کر کے ان گراں بہا نتائج تک مشکل سے پہنچ سکے گا جو ان ۳۳ صفحات کو بغور پڑھ لینے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

قرآن فہمی کے ہر شائق کو اس میدان میں اترنے سے پہلے ان اوراق کا مطالعہ افراط و تفریط یا تقلید والحاد کی بہت سی کجراہیوں سے بچا کر منزل مقصود پر لے جائے گا۔

دوسرا مضمون ''تفسیر بالروایت'' ہے۔ اگرچہ یہ علم تفسیر سے الگ کوئی چیز نہیں ہے لیکن مولانا نے اس میں بھی ایک ضرورت کو خاص توجہ سے پورا کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔ بدقسمتی سے ہمارے جامد طبائع نے ہر پرانی چیز کو صرف اس لیے کہ وہ پرانی ہو چکی ہے۔ یا اس کو پرانے لوگوں کی بعض جماعتوں کی حمایت حاصل ہے نقد کا لباس پہنا کر ''دینی'' شرف کا درجہ دے دیا ہے۔ مولانا کا اصل مقصود یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کا صحیح مرتبہ دو۔ سنت کی طرف منسوب باتوں کو آفتاب قرآن کی روشنی میں رکھو مشعل عقل کے

سامنے لاؤ تم کو ان کے تمام خدوخال صاف صاف نظر آ جائیں گے۔ اس طرح غلطی سے بچ سکو گے۔ چنانچہ اس مطلب کو واضح کرنے کے لیے مثال کے طور پر ایسی چودہ روایتیں لائے ہیں جن میں سے بعض صراحتاً خلاف قرآن ہیں اور بعض ایسی ہیں جو دوسری روایتوں سے متعارض ہیں اور بعض علم و عقل کے قطعاً خلاف ہیں۔۔۔۔۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی تفسیروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات سے منسوب کرنا مرتبۂ رسالت کے منافی ہے۔

تیسرا مضمون ''علم حدیث'' کے عنوان سے معنون ہے۔ اس میں کئی ذیلی عنوان ہیں: روایت حدیث' کتابت حدیث' وضع حدیث' تنقید حدیث' اصول حدیث' دلائل حدیث' قرآن وحدیث' عقل اور حدیث' رتبہ حدیث اور حقیقت حدیث۔۔۔۔۔ علم حدیث کا طالب علم اس بحر میں غوطہ لگانے سے پہلے یا دوران شناوری ہی میں سہی۔۔۔۔ ان پر ایک نگاہ انصاف ڈال لے تو وہ اپنی آنکھوں پر سے بہت سے حجاب ہٹتے ہوئے محسوس کرے گا اس میں مولانا نے جہاں تاریخ کے دقیقے نکالے ہیں' وہاں اپنی مجتہدانہ بصیرت کا بھی بہترین ثبوت دیا ہے۔ حضورؐ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے کسی چیز کو دینی مرتبہ نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اپنے ارشادات کی کتابت سے منع فرما دیا' صحابہؓ کا اسی پر عمل رہا۔ چنانچہ اس زمانے کی کوئی کتاب آج موجود نہیں' لیکن وضع حدیث کا بیج بھی اسی مقدس زمانہ میں بویا جا رہا تھا اور صحابہؓ کے بعد تو اس نے درخت کی شکل اختیار کر لی' ہزاروں آدمی ایسے پیدا ہوئے جن کا پیشہ ہی وضاعی و کذابی قرار پایا۔ پھر جب دینی فضا پر وضع و کذب کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تو اہل تنقید اپنے ٹمٹاتے ہوئے چراغ لے کر نکلے (**شکر الله سعیهم**) لیکن اس دودھ میں گھلے ہوئے زہر کو الگ کر لینا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔۔۔۔۔ اس کی شرح آپ کو تنقید حدیث میں ملے گی۔۔۔۔۔ حدیث کی دینی حیثیت پر محدثین نے کچھ دلائل قرآن مجید سے بھی پیش کیے ہیں۔ مولانا نے ایک ایک کا ذکر کر کے اس کا شافی جواب دیا ہے۔۔۔۔۔ ''قرآن وحدیث'' کے تحت قرآن سے ثابت کیا ہے کہ ایمانی کتاب صرف قرآن ہی ہے اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے مدار ایمان قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک آیت لاتے ہیں۔

**ومن الناس من یشتری لهو الحدیث الخ۔ (۳۱/۶)**

اور بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں۔

مولانا کے نزدیک یہاں حدیث سے مراد حدیث منسوب الی الرسول ہے' حالانکہ یہ زمانہ مابعد کی اصطلاح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی حدیث کے صفات بیان فرما دیئے ہیں:

(۱) لیضل عن سبیل اللہ (۲) بغیر علم (۳) ویتخذھا ھزوًا

(۱) اللہ کی راہ سے گم راہ کرنے والی بات (۲) علم و یقین سے محروم (۳) دین کو مذاق بنانے والی

لیکن اس کو کسی ایک ذات کی طرف منسوب شدہ باتوں سے مقید نہیں کیا جا سکتا ہر بات یا ہر شخص کی بات جس میں یہ تین صفتیں پائی جائیں اس کو ''لھو الحدیث'' کہا جائے گا۔ (واللہ اعلم بالصواب) ۔۔۔۔۔ حدیث کی عقلی حیثیت میں اختصاراً ''روشنی'' ڈالی گئی ہے مگر جامعیت کے ساتھ' ایک صاحب عقل کے لیے اسی قدر کافی ہے۔

''رتبہ حدیث'' کے تحت تمام مساعی حدیث کا عطر چند لفظوں میں کھینچ دیا ہے۔

''الغرض حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے' اس سے تاریخی فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں ۔۔۔۔۔ اس کو دین بنا لینے سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ قرآن کریم جو سراسر زندگی ہے' حجاب میں آ گیا۔'' الخ

''حقیقت حدیث'' کی ذیل میں کئی باتیں ایسی ہیں جو پہلے آ چکی ہیں لیکن بعض نئی باتیں آ جانے کی وجہ سے یہ ایک الگ مضمون بن گیا ہے' جو اپنی جگہ پر افادے سے خالی نہیں۔''

سب سے آخر فقہ پر ایک اجمالی تبصرہ ہے' اس میں بھی حضرت مولانا نے قابل ستایش ایمانی جرأت سے کام لیا ہے۔ تاریخ اسلام کی بڑی سے بڑی شخصیت کو کتاب اللہ سے ذرا ادھر ادھر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کو علماء کی عام روش کے مطابق کسی تاویل سے نہیں ڈھانپتے' بلکہ نہایت احسن انداز سے نکتہ چینی فرماتے ہیں' اس باب میں حضرت فاروق اعظمؓ کے بعض فیصلے قابل توجہ ہیں۔

مولانا کے مسلک میں ایک اہم چیز ''تواتر'' ہے جس سے متعلق آپ کے بعض مضامین میں اشارات ملتے ہیں۔ اس مضمون میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''بعض آیات میں جزوی احکام بھی ہیں' مگر زیادہ تر ایسی ہیں' جو اصول کا حکم رکھتی ہیں'

جن کی تفصیل یا تشکیل آنحضرتؐ اپنے قول یا عمل سے کرتے تھے۔۔۔۔ اس طرح امت کے پاس شریعت کے لیے دو چیزیں ہوگئیں۔ احکامی آیات اور رسول اللہؐ کے استنباطات، جن کو فقہ میں کتاب وسنت کہتے ہیں۔''

اس پر حاشیہ میں رقمطراز ہیں:

''یہاں سنت سے آنحضرتؐ کا ہر قول وفعل مراد نہیں بلکہ وہ اقوال واعمال مراد ہیں جن کی اصولی تعلیم قرآن میں ہے اوران کی تفصیل یا تشکیل حضورؐ نے فرمائی یہ سنت امت میں عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے، جو یقینی اور دینی ہے، لیکن اس کے متعلق جو روایات ہیں وہ تمام ترظنی ہیں، ان کی قبولیت قرآن یا عمل متواتر سے موافق ہونے کی وجہ سے ہوگی۔''
(علم فقہ ص ۱۳۴)

یہاں شبہ ہوتا ہے کہ امت کے پاس دو چیزیں یقینی اور دینی اور بالکل مساوی المرتبہ ہیں۔قرآن اور عمل متواتر یا سنت، لیکن جب ہم قرآن سے باہر نکل کر عمل متواتر کی تلاش کرتے ہیں تو مشکل ہی سے اس کی کوئی ''کل'' سیدھی بیٹھی نظر آتی ہے جیسا کہ مولانا ابوالکلام نے لکھا ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کوئی خاص اسلامی عمل ہی ترک نہیں کر دیا ہے بلکہ ان کی پوری زندگی غیر اسلامی ہوگئی ہے ان کی فکری حالت غیر اسلامی ہے، ان کی عملی رفتار غیر اسلامی ہے، ان کا دینی زاویہ نگاہ غیر اسلامی ہوگیا ہے وہ اگر اسلامی احکام پر عمل بھی کرنا چاہتے ہیں تو غیر اسلامی طریقہ سے۔ یہ دینی تنزل کی انتہا ہے۔ **فما هولآء القوم لایکادون یفقهون حدیثا**.'' (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۱۳۵)

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل حقیقی صرف کتاب ہے اور عمل متواتر بشرط موافقت کتاب ثانوی درجہ پر اصل کا حکم رکھتا ہے۔ جیسا کہ مولانا نے خود اپنے ایک قدیم مضمون میں لکھا ہے:

مسلمان کے لیے وہ عمل دینی ہوگا جو آنحضرتؐ سے امت میں نسلاً بعد نسل آج تک متواتر چلا آتا ہو بشرطیکہ اس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہو۔۔۔۔ آج مسلمانوں میں بہت سے اعمال جن کی تعداد کم نہیں ہے دین کے نام سے جاری ہیں۔ حالانکہ ان کا کوئی حکم قرآن میں نہیں ہے، ان کو دین سمجھنا افراط ہے۔'' (تواتر، مطبوعہ بلاغ مئی ۱۹۳۷ء)

آخر میں ہم دلی مسرت سے اس کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس نے اردو داں طبقہ کو ایک ایسا تحفہ دیا جس سے وہ بالکل محروم تھا اردو زبان کے سرمایے میں ایک ایسا اضافہ کیا ہے جس کی واقعی ضرورت تھی۔ اہل تحقیق کی آنکھوں پر ایک ایسی عینک رکھ دی ہے جس سے بہت سی چیزیں جو مختلف گوشوں میں مستور پڑی تھیں ایک ہی جگہ اکٹھی نظر آنے لگیں گی۔

اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائیں!

عرشی

# علم تفسیر

قرآن کریم ایسی صاف عربی زبان میں نازل ہوا جس کو عام طور پر اہل عرب سمجھتے تھے' خود قرآنی آیات میں قرآن کی زبان ''عربی مبین'' کہی گئی ہے یعنی بین اور واضح یہی وجہ ہے کہ خود قرآن نے اپنی بھی صفت یہی بیان کی ہے یعنی ''الکتاب المبین'' بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے کو ''نور مبین'' کہا ہے۔ نیز آیات قرآنی کو بھی ''ایات بینات'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔

الغرض قرآن کی زبان' قرآن کی تعلیم اور قرآنی آیات کا مفہوم سب خود قرآن کے بیان کے مطابق واضح' کھلا ہوا بلکہ جگمگاتا ہوا نور ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس نے بار بار تصریح کی ہے کہ ''وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ'' اور ہم نے قرآن کو نصیحت لینے کے لیے آسان کر دیا' کوئی ہے جو نصیحت لے؟ نصیحت لینے کی آسانی کو دیکھنے کے لیے خود اہل عرب پر نظر ڈالنا کافی ہے' جو قرآن کے اولین مخاطب اور بالعموم بدوی اور ناخواندہ تھے' جس کی وجہ سے قرآن نے ان کو ''امیین'' کا لقب دیا اور فرمایا'' هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ'' وہی اللہ جس نے ناخواندہ لوگوں میں انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا۔ ان امیوں نے بے تکلف قرآن کو سمجھا اور اس کے اوپر عمل کیا۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

**اِنَّ الْقُرآن نزل بلغة العرب على اساليب بلاغتهم فكانوا كلّهم يفهمون و يعلمون معانيه فى مفرداته و تراكيبه۔**[1]

قرآن عرب کی زبان میں ان کے انداز بلاغت کے مطابق نازل ہوا۔ ہر ایک اس کو سمجھتا تھا اور اس کے مفردات و مرکبات کے معانی کا علم رکھتا تھا۔

علامہ موصوف کا مقصد غالباً یہ ہے کہ اہل عرب بالعموم قرآن سے اس کی تعلیمات کو سمجھتے تھے' ورنہ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۶۷

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر فرد امت عربیہ کا اس کے جملہ الفاظ کے معانی اور اس کی تمام تراکیب کی تفصیلات کا عالم نہیں ہوسکتا تھا۔ خود حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق روایت ہے کہ کسی نے ان سے "وَفَاکِهَةً وَابًّا" میں "ابًّا" کے معنی پوچھے جواب دیا کہ ہم کو تکلف وتعمق سے ممانعت کی گئی ہے۔ ایک بار انہوں نے منبر پر یہ آیت پڑھی "اَوْ یَاْخُذَهُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ" اور حاضرین سے تخوف کے معنی دریافت کیے۔ بنی ہذیل کے ایک شخص نے کہا کہ اس کے معنی تنقص یعنی کم کرنے کے ہیں اور سند میں یہ شعر پڑھا:[1]

تَخَوَّفَ الرَّحْلُ مِنْهَا تَامِکًا قَرِدًا کَمَا تَخَوَّفَ عُوْدَ النَّبْعَةِ السَّفَنُ

علیٰ ہذا ایک بار جمعہ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ میں اپنے بعد جو امور سب سے اہم چھوڑ جاؤں گا ان میں مسئلہ کلالہ بھی ہے۔ میں نے جس قدر بار بار اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور کسی مسئلہ کو نہیں پوچھا۔ اور اس میں آپ نے جس قدر سختی میرے ساتھ روا رکھی اور کسی مسئلہ میں روا نہیں رکھی۔ یہاں تک کہ اپنی انگلی میرے سینہ پر رکھ کر فرمایا کہ اے عمر! کیا تیرے لیے اس امر میں آیت صیف کافی نہیں ہے جو سورۂ نساء کے آخر میں ہے۔[2]

یہ واقعات تو حضرت عمرؓ کے بیان کیے گئے ہیں۔ جن کے علمی اور عقلی رتبہ سے ہم سب واقف ہیں۔ پھر دوسرے تمام صحابہؓ کے متعلق یہ کیوں کر دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہر لفظ اور ہر ترکیب قرآنی کا علم رکھتے تھے ہاں ایک اجمالی مفہوم ضرور سمجھ لیتے تھے مثلاً "وفاکهة وابا" میں ان کے لیے یہ سمجھ لینا کافی تھا کہ یہاں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا ذکر ہے "ابا" بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ ہر آیت کے تفصیلی معانی تک پہنچنے کی تکلیف لازمی نہیں خیال کرتے تھے لیکن اس سے یہ اندازہ کر لینا کہ وہ بالعموم آیات قرآنی کے سرسری مفہوم پر قانع تھے صحیح نہیں ہوسکتا' ابوعبدالرحمٰن سلمی سے روایت ہے کہ صحابہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آیتیں سیکھتے تھے تو جب تک ان کی علمی اور عملی حقیقت کو جان نہیں لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے' یہی وجہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی سورۂ بقرۂ اور آل عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نگاہوں میں بڑا ہو جاتا تھا۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں زیادہ تر آیات محکمات ہیں جو اصول دین اور احکام شریعت سے

---

1. کتاب الموافقات ص ۵۷-۵۸۔
2. تفسیر ابن جریر ج ۶ ص ۲۶۔
3. مسند امام احمد

تعلق رکھتی ہیں یا انبیاء کرامؑ اور اقوام سالفہ کے نتیجہ خیز اور عبرت انگیز قصص ہیں' ان کا سمجھنا جمہور کے لیے آسان ہے مگر اسی کے ساتھ آیات متشابہات اور حقائق غامضہ بھی ہیں' جن کو صرف راسخون فی العلم ہی سمجھ سکتے ہیں اور صحابہ کرامؓ میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی نگاہوں میں عام طور پر اس کا عملی پہلو غالب تھا۔

یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ ظاہری اور عملی حیثیت کے علاوہ قرآن کریم کی نظری اور عقلی حیثیت بھی اہم ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو آسانی کے ساتھ صرف چند اجزا میں نمایاں اور صاف لکھی جا سکتی ہے' قیامت تک کے لیے امت اسلامیہ کا دستور العمل بنائی گئی ہے۔ اور ہر زمان اور ہر مکان میں اس کی ہدایت کا نصاب قرار دی گئی ہے' اگر یہ ایسے حقائق جاودانی پر مشتمل نہ ہوتی' جن کو ابدالآباد تک انسانی نسلیں ختم نہ کر سکیں گی تو کیوں کر ان کا دائمی نصاب ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتی؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے صرف عملی نصیحت ہی لینے کی ہدایت نہیں کی گئی' بلکہ اس میں تفکر اور تدبر کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے مثلاً

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ (۲۸/۳۸)

مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں۔

دوسری جگہ ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ط (۸۲/۴)

کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں۔

ایک اور روایت ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ.

(۴۴/۱۶)

اور ہم نے تیری طرف قرآن' اتارا تاکہ لوگوں کے لیے جو اتارا گیا ہے اس کو ان کے سامنے بیان کر دے اور تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں۔

الغرض اہل نظر کو قرآن نے اپنی آیات میں فکر و نظر کی دعوت دی ہے تاکہ وہ ان سے اپنی ہدایت لیتے اور اپنی فلاح کا راستہ نکالتے رہیں۔

یہی وجہ تھی کہ عہد رسالت میں فقہاء صحابہؓ اس کی آیات میں تدبر کرتے تھے اور بعض امور کو جو ان

کے سامنے فی الجملہ واضح نہیں ہوتے تھے خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے تھے لیکن بہت کم' کیونکہ کثرت سوال کی آفتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔

علامہ سیوطی نے اپنی مفید کتاب الاتقان فی علوم القرآن کی آخری فصل میں ان تمام تفسیری روایتوں کو جمع کر دیا ہے جو صحابہؓ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی ہیں۔ وہ کل کی کل ان کی کتاب کے بیس صفحوں سے بھی کم ہیں اور تنقید صحیح کے بعد تو بہت ہی تھوڑی رہ جاتی ہیں۔

## مفسرین صحابہ کرامؓ:

جن صحابہ کرامؓ سے یہ تفسیر کی روایتیں آئی ہیں ان میں سے جو حضرات خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں وہ خلفائے اربعہ' عبداللہ بن مسعودؓ' ابی بن کعبؓ' زید بن ثابتؓ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان میں سے حضرات شیخین بوجہ ان کے تقدم عہد اور امور امت میں مشغولیت کے نہایت کم روایتیں ہیں۔ حضرت عثمانؓ اگرچہ قرآن سے اس قدر شغف رکھتے تھے کہ رات کا بڑا حصہ کھڑے ہو کر اس کی تلاوت میں گزارا کرتے' بلکہ کبھی کبھی خضوع وخشوع میں جب محویت کا عالم طاری ہو جاتا تو ایک ہی آیت کو بار بار گھنٹوں تک دہراتے رہتے' مگر تفسیر کی روایتیں ان سے بھی بہت کم مروی ہیں۔ زیادہ روایتیں حضرت علیؓ سے کی گئی ہیں جو شوق دلاتے رہتے تھے کہ لوگ قرآن سیکھیں اور سمجھیں اور اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ تم کو کتاب اللہ کی بابت جو کچھ پوچھنا ہے میری زندگی ہی میں مجھ سے پوچھ لو۔ کیونکہ میں علم رکھتا ہوں کہ کون سی آیت کہاں اتری' کب اتری اور کس کی بابت اتری اور دربار نبویؐ میں میں سوال کی جرات بھی زیادہ رکھتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی زیادہ روایتیں آئی ہیں جو سابقین اولین میں سے تھے اور جن کا لقب بوجہ اس کے کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں اکثر حاضر رہتے اور آپؐ کی نعلین بھی اٹھاتے تھے' صاحب النعلین تھا۔ انہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے قرآن کی ستر سورتیں یاد کی تھیں اور اپنے تمام انداز عمل میں آپ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت پیدا کرتی تھی۔ ان کی وفات ۳۲ھ میں ہوئی۔

حضرت ابی بن کعب خزرجی انصاریؓ عہد رسالت میں کاتب وحی تھے اور صحابہؓ میں سید القراء اور قرآن کے عالم مانے جاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں انتقال فرمایا اور انہوں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

حضرت زید بن ثابتؓ کاتب دربار رسالت نجباء انصار اور علماء قرآن میں سے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری رمضان میں قرآن کا جو دور فرمایا تھا اس میں شریک تھے' جس کی وجہ سے عہد صدیقی میں جب قرآن ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا' یہی اس کے جامع قرار پائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کی رکاب تھاما کرتے تھے اور کہتے تھے کہ علماء کی تکریم اسی طرح کرنی چاہیے ۴۰ھ میں وفات پائی۔

مگر ان دونوں حضرات یعنی ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے تفسیریں کم مروی ہیں۔ سب سے زیادہ روایتیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آئی ہیں جن کا لقب بوجہ قرآن دانی کے حبر امت اور ترجمان القرآن تھا۔ ان کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی تھی کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَ عَلِّمْہُ التَّاوِیْل" اے اللہ! اس کو دین کی فقاہت اور قرآن کی فہم عطا فرما۔

یہ اگرچہ صغار صحابہؓ میں سے تھے مگر حضرت عمرؓ ان کی عقل و فراست اور قرآن فہمی کی وجہ سے ان کو اپنی مجلس شوریٰ میں شریک رکھتے تھے اور مشکل امور میں رائے لیتے تھے۔ ان کا انتقال ۶۸ھ میں ہوا۔

ان حضرات کے علاوہ ابوموسیٰ اشعری' عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن زبیرؓ' جابر بن عبداللہؓ' ابوہریرہؓ' انس بن مالک اور ام المومنین حضرت عائشہ و بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔

اکثر صحابہ کرامؓ بہ نظر احتیاط انہیں معانی پر اکتفا کرتے تھے جو بعض الفاظ یا آیات قرآن کی تشریح کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسموع ہوئے تھے' خود قرآن کی تفسیر میں کچھ کہنے سے پرہیز کرتے تھے چنانچہ ابن سیرین نے کہا ہے کہ میں نے عبیدہ سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور سیدھے چلو لیکن بعض صحابہؓ مثلاً ابن مسعود اور ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم قرآن میں تدبیر اور تفکر کو ضروری سمجھتے تھے ان کے نزدیک جو چیز ناجائز تھی وہ یہ تھی کہ بلا حقیقت کو پہنچے اور اچھی طرح سمجھے ہوئے آیات کی تفسیر کی جائے یا بعض اہل مذاہب مثلاً خارجی' شیعہ' قدری' مرجی وغیرہ جو اس وقت پیدا ہو چکے تھے ان کے عقائد کے مطابق تاویل کی جائے۔[1]

اس زمانے میں تفسیر کے لیے عربی زبان' جاہلیت کے رسوم و عادات جن کو قرآن نے مٹایا ہے' عہد رسالت کے واقعات جن کا تعلق قرآن سے ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال' اعمال اور قضایا

---

[1] فجر الاسلام صفحہ ۲۳۵

وغیرہ کا جاننا ضروری تھا' انہیں کی مدد سے آیات کی تشریح کرتے تھے۔

## اسرائیلیات:

قرآن میں دینی تعلیم کے علاوہ ایسے تاریخی حقائق بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا علم اصلاح نفوس بشری کے لیے ضروری ہے مثلاً عالم کی تکوین' آدم کی پیدائش اور انبیاء سابقین اور اقوام گزشتہ کے واقعات۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر سنتی ہے تو اس کے متعلق مزید معرفت کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے' اس لیے عہد صحابہؓ میں لوگ ان امور کو ان علماء اہل کتاب سے جو اسلام لا چکے تھے' دریافت کرتے تھے خود حضرت ابن عباسؓ حبر امت بھی ابن جریر طبری کے بیان کے مطابق کعب احبار کے پاس بیٹھتے اور ان کی روایتوں کو اخذ کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کر دیا تھا کہ "اہل کتاب کے اقوال کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب" مگر چونکہ ان امور کا تعلق اعمال شریعت کے ساتھ نہ تھا' اس وجہ سے ان کے لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا' اس طرح پر اہل کتاب کی روایتیں بھی تفسیر قرآن میں شامل ہو گئیں' علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے:

> بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے' نہ علم رکھتے تھے۔ ان کے اوپر بدویت غالب تھی جب ان کو موجودات کے اسباب' ابتدائے تخلیق اور امم سابقہ کے حالات وغیرہ کے جاننے کا شوق ہوتا تو ان اہل کتاب سے جو مسلمان ہو گئے تھے دریافت کرتے یہ بھی زیادہ تر انہیں کی طرح بدوی تھے اور ان امور کو اسی قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہل کتاب۔ انہیں کے بیانات لوگوں سے منقول ہو کر آیات کی تفسیروں میں داخل ہو گئے اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا' تدوین کے وقت مفسروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور انہیں کو کتب تفاسیر میں درج کر دیا۔[1]

عہد رسالت میں اہل کتاب میں سے جو حضرات اسلام لائے تھے۔ ان میں سب سے پہلے یہودی عالم جن کو قرآن کریم نے "اَوَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ اٰیَۃً اَنْ یَّعْلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" کہہ کر اہل علم میں شمار کیا ہے' حضرت عبداللہ بن سلام ہیں جو ہجرت نبویؐ کے بعد ہی مدینہ میں اسلام لائے ان کا انتقال ۴۰ھ میں ہوا۔ ان سے حضرت ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ نے روایت کی ہے۔

---

[1] مقدمہ ص ۳۶۷

دوسرے حضرت سلمان فارسیؓ ہیں۔ یہ اصلاً مجوس بلکہ ایک آتش کدہ کے متولی کے عزیز فرزند تھے۔ گھر سے نکل کر ملک شام میں گئے وہاں عیسائیت اختیار کر لی ایک مدت تک نصیبین اور اس کے بعد اموریہ میں رہے اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل کیا پھر عرب کی طرف آئے۔ وادی القریٰ میں بنی کلب نے غداری سے ان کو غلام بنا لیا اور فروخت کر ڈالا۔ قسمت کی یاوری سے مدینہ پہنچے۔ وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مدائن میں وفات پائی۔ [1]

جس طرح حضرت بلالؓ کو حبشیوں نے اور حضرت صہیبؓ کو رومیوں نے اپنا قومی افتخار اور نمونہ بنایا اسی طرح اہل فارس نے اسلام لانے کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ کو اپنی قوم کا پیش رو قرار دیا۔ ان کے حالات میں غیر معمولی باتیں بڑھائیں اور ان کی طرف بہت سی روایتیں منسوب کیں۔ بالخصوص صوفیہ عجم نے جن میں سے اکثر اپنا سلسلہ ارادت ان تک پہنچاتے ہیں۔

تیسرے صحابی جن سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں۔ حضرت تمیم داریؓ ہیں جو ۹ھ میں مدینہ میں آ کر مسلمان ہوئے تھے۔ یہ نصارائے یمن میں سے تھے اور قصہ گوئی کرتے تھے۔ یعنی گزشتہ انبیاء اور اقوام کے حالات سناتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں ان سے قصہ گوئی کی اجازت طلب کی مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ آخر میں ان کے بہت اصرار کی وجہ سے صرف اس قدر اجازت دی کہ جمعہ کے دن اس سے پہلے کہ میں جماعت کے لیے نکلوں تم قصے سنایا کرو۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کو ہفتہ میں دو دن کی اجازت مل گئی۔ [2] جساسہ اور دجال کی روایتیں انہیں سے مروی ہیں۔

اس قصہ گوئی کی دو صورتیں ہوتی تھیں ایک قصص عامہ کہ مسجد میں قصاص مسلمانوں کے مجمع میں بیٹھ کر ان کو دوسری قوموں کے وہ حکایات اور حالات سناتا جو اس نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے دوسری قصص خاصہ جو کسی بڑے آدمی کے سامنے بیان کیے جاتے تھے۔ [3]

عہد صحابہ ہی میں قصہ گوئی کا رواج عوام کی دلچسپی کی وجہ سے بہت بڑھ گیا اور چونکہ یہ قصے کذب آمیز بلکہ زیادہ تر بے بنیاد افسانے ہوتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں قصہ گویوں کو مسجدوں میں بیٹھنے کی ممانعت کر دی۔ بجز حسن بصری کے کہ وہ سچائی کا خیال رکھتے تھے۔ [4]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۵۳۔ [2] اصابہ ج ۱ ص ۸۴۔
[3] خطط مقریزی ج ۲ ص ۲۵۳ [4] فجر الاسلام ص ۱۸۸۔

## تابعین:

عہد صحابہؓ کے بعد روایت تفسیر میں مندرجہ ذیل حضرات نے زیادہ شہرت پائی۔

عکرمہ مولیٰؒ ابن عباس جوان کے مخصوص ترین شاگرد بھی تھے۔ یہ اپنے آقا یعنی عبداللہ بن عباسؓ نیز حضرت عائشہؓ اور ابوہریرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

عطاء بن رباحؒ۔ یہ حضرت عثمانؓ اسامہ بن زید حضرت عائشہ ام سلمہ ابوہریرہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ علماء مکہ میں فتوے کی ریاست انہیں پر منتہی تھی۔ ۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

ضحاک بن مزاحم خراسانیؒ۔ یہ حضرت ابن عباس ابن عمر زید بن ارقم اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ وفات ۱۰۵ھ ہے۔

سعید بن جبیر کوفیؒ۔ یہ ابن عباس عدی بن حاتم اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے حکم سے قتل کیے گئے۔

مجاہد بن جبیرؒ۔ یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں اور زیادہ انہیں سے روایت کرتے ہیں ۱۰۳ھ میں مکہ میں عین سجدہ کی حالت میں وفات پائی۔

حسن بصریؒ۔ یہ انس بن مالک جندب بن عبداللہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ ۱۱۰ھ میں انتقال فرمایا۔

ان کے علاوہ امام مسروق زید بن اسلم قتادہ ابوالعالیہ ربیع بن انس اور عوفیؒ وغیرہ اس طبقہ کے علماء تفسیر میں ممتاز ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ تفسیر کا علم زیادہ تر علماء مکہ میں تھا جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مثلاً عکرمہ مجاہد اور عطاء پھر اہل کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے اصحاب تھے جیسے حسن بصری اور مسروق وغیرہ۔

اس عہد میں اسرائیلیات میں بہت اضافہ ہوا کیونکہ عوام کا رجحان ان کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ اس کو علمی تحقیق سمجھنے لگے تھے۔ کہ قرآن میں جن انبیاء اور اقوام کے قصص ہیں۔ ان کے متعلق مزید حالات کا پتا لگائیں۔ اس لیے جزئی سے جزئی اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی دریافت کرنے لگے۔ مثلاً سفینہ نوح کی مقدار اور وسعت۔ اس میں جن جانداروں کے جوڑے لادے گئے تھے۔ ان کے اقسام

حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں چاروں پرندوں کے انواع' حضرت خضرؑ کے ذکر میں غاصب بادشاہ کا خاندان اور اس بچہ کا نام ونسب جس کو خضرؑ نے قتل کیا تھا۔ حضرت یوسفؑ نے جن گیارہ ستاروں کو خواب میں دیکھا تھا' ان کے نشانات ومقامات۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ان کی بیوی کے متعلق تحقیق کہ وہ حضرت شعیبؑ کی چھوٹی بیٹی تھیں یا بڑی پھر یہ کہ انہوں نے آٹھ یا دس سال کی دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت پوری کی۔ اصحاب کہف کے نام اور ان کے کتے کے رنگ ونسل غرض اسی قسم کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں امور کی بابت جن کو قرآن کریم نے غیر ضروری ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا' بحث وتفتیش کرنے لگے۔ یہی معلومات روایات کے ذریعہ سے پھیلیں۔ اور جب تفسیریں مدون ہوئیں تو ان میں درج کی گئیں۔

ان روایات کا سب سے بڑا مرجع دو شخص ہیں۔ ایک کعب بن ماتع جو یمن کے یہودی تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائے اور مدینہ میں رہنے لگے۔ یہ کعب احبار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان سے حضرت ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ کے توسط سے زیادہ روایتیں آئی ہیں۔

دوسرے وہب بن منبہ۔ یہ بھی یمن کے یہودی مگر فارسی الاصل تھے۔ ان کی وفات صنعاء میں ۱۱۰ھ میں ہوئی۔ اسرائیلیات میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ علماء ثقات مثلاً قتیبہ یا امام نووی وغیرہ نے ان کی کوئی روایت اپنی کتابوں میں درج نہیں کی۔ ابن جریر طبری نے اگرچہ ان سے قطعی پرہیز تو نہیں کیا ہے مگر بہت کم روایتیں لی ہیں۔ لیکن ثعلبی وغیرہ نے انبیاء کے قصوں میں زیادہ تر ان ہی کی مرویات درج کی ہیں۔[1]

یہاں اس حقیقت کا بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عرب کے ہر حصہ سے زیادہ یہودی ثقافت یمن میں شائع تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے اہل کتاب مسلمانوں سے اس قسم کی روایتیں زیادہ منقول ہوئیں۔

## اتباع تابعینؒ:

اس طبقہ میں بالعموم حاملین روایت کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ ان میں سے جن کے نام تفسیر کے ساتھ مشہور ہوئے حسب ذیل ہیں:

---

[1] فجر الاسلام ص ۱۹۰۔

عطاء بن دینار متوفی ۱۲۶ھ مقاتل بن سلیمان متوفی ۱۵۰ھ سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ وکیع بن الجراح متوفی ۱۹۶ھ سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ نیز ابن جریج' اسحٰق بن راہویہ' آدم بن ایاس' عبد الرزاق اور امام مالک وغیرہ۔

اس طبقہ کے لوگوں نے تفسیر میں کتابیں بھی مدون کرنی شروع کیں چنانچہ تاریخوں میں ان میں سے بعض تفاسیر کا ذکر ہے' مثلاً تفسیر ابن جریج' تفسیر سفیان بن عیینہ' تفسیر وکیع بن الجراح' تفسیر شعبہ' تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ' مگر یہ سب کی سب فنا ہوگئیں اور ان میں سے کوئی بھی امت کے ہاتھوں میں باقی نہیں رہی۔

ان کا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنے شیوخ سے جو روایتیں قرآن کی تفسیر میں سنتے' ان کو قلم بند کر لیتے تھے۔ بڑا حصہ اسرائیلیات کا ہوتا تھا' جس کی وجہ ہم پہلے ظاہر کر چکے تھے اس طبقہ میں ان روایات کے بطل کبیر ابن جریج ہیں جن کی نسبت بعض ائمہ جرح و تعدیل نے تصریح کی ہے کہ روایتیں وضع کرتے تھے۔[1] یہ ۸۰ھ میں اسلام لائے تھے اور ۱۵۰ھ میں انتقال کر گئے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ روی الاصل تھے اور امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ ابن جریج نے ۹۰ عورتوں سے متعہ کیا تھا۔[2] ابن خلکان کے بیان کے مطابق سب سے پہلی تفسیر اسلام میں انہوں نے ہی مدون کی۔

تبع تابعین کا سلسلہ دوسری صدی ہجری کے خاتمہ تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد ان کے شاگردوں کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد یعنی تیسری صدی ہجری میں تدوین کتب عام ہوگئی۔ اسی میں صحاح ستہ لکھی گئیں' جن میں تفسیر کی روایتیں کتاب التفسیر کے عنوان سے سورتوں کی ترتیب پر جمع کی گئی ہیں۔ ان کا بھی عام انداز وہی ہے جو ان کے اساتذہ کا تھا۔ یعنی انہوں نے جستہ جستہ الفاظ و آیات قرآن کے متعلق متقدمین سے جو روایتیں سنی ہیں ان کو درج کر دیا ہے۔ یہ روایتیں بالعموم صحابہ کرامؓ یا ان کے تلامذہ کی ہیں' خال خال ہیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہیں۔ کتب صحاح ستہ کے تفسیروں کے یہ ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورہ کے ایک یا دو لفظوں اور کسی سورہ کی صرف ایک یا دو آیتوں کے متعلق روایات درج کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ روایات قرآن کی تفسیروں کے لیے نہایت اہمیت رکھتی ہیں مگر خود ان سے اس کا کوئی گوشہ بھی سیراب نہیں ہوتا۔

---

[1] فجر الاسلام ص ۲۴۲

[2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۳۔

## تنقید تفسیر:

زیادہ تر اسی زمانہ یعنی تیسری صدی ہجری میں ائمہ جرح وتعدیل نے راویوں اور روایتوں کی تنقید کی۔ تفسیری روایات کا بڑا حصہ بوجہ ان کے رواۃ کے ضعف کے مشکوک ثابت ہوا' کیونکہ ضحاک بن مزاحم' مقاتل بن سلیمان' ابوصالح مصری' محمد بن سائب کلبی' السدی' محمد بن مروان' بشیر بن عمار اور عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں جانچنے سے کمزور بلکہ بعض ان میں سے وضاع نکلے۔[1]

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صحابہ کرامؓ میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کے نام سے تفسیر کی روایتیں زیادہ آئی ہیں اور یہی رواۃ کی کمزوری کی وجہ سے عام طور پر موضوع اور مجعول نکلیں' جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے شیعہ ان ہی اقوال کو زیادہ احترام اور قبولیت کی نظر سے دیکھتے تھے جو ان کے نام کے ساتھ منسوب ہوں' اس لیے شیعہ رواۃ بیشتر انہیں کے نام سے روایتیں کرتے تھے بلکہ جو بات ان کے ذہن میں ایسی آتی تھی' جس سے حضرت علیؓ کا علمی رتبہ ظاہر ہو۔ اس کو انہیں کی طرف منسوب کرتے تھے چنانچہ ابن ابی جمرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو صرف فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا بوجھ تیار کر دوں۔[2] وضع کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حضرت علیؓ کے نام سے جو روایات کی گئی ہیں۔ ان کی تعداد ۶۸۶ ہے جن میں سے ائمہ حدیث کے نزدیک اصول کی رو سے صرف پچاس صحیح ہیں۔[3]

حضرت ابن عباسؓ جن کی نسل سے خلفائے عباسیہ تھے' مقربین بارگاہ کا مخصوص موضوع تھے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ خالی نہ ہوگا جس کی تفسیر میں ان سے روایت نہ کی گئی ہو۔ ان کی کل روایتوں کی تعداد ۱۶۶۰ ہے۔[4] جن میں سے امام شافعی کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں جو صحیح مانی گئی ہیں۔[5]

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جتنے طرق ہیں ان میں سب سے معتبر طریقہ "**ابن صالح عن علی بن ابی طلحة عن ابن عباس**" ہے مگر جملہ حفاظ حدیث کا اجماع ہے کہ علی بن ابی طلحہ کی لقاء

---

[1] مراۃ التفسیر ص ۲۰ تا ۲۸۔ [2] فجر الاسلام ص ۲۳۸

[3] الملل والنحل لابن حزم ج ۴ ص ۱۳۷ [4] مراۃ التفسیر ص ۱۳

[5] اتقان ج ۲ ص ۱۹۶

حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ ان کے نام سے کہتے ہیں دراصل مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایتیں ہوتی ہیں۔ دوسرا طریق جس کو محدثین نے شیخین یعنی امام بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق تسلیم کیا ہے ''قیس عن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس'' ہے مگر اس سلسلہ سے صرف چند ہی روایات ہیں۔ باقی دوسرے تمام طرق مجروح ہیں۔ جو یبر عن ضحاک سخت ضعیف سلسلہ ہے۔ ابن جریج نے جو کچھ روایت کیا ہے اس میں صحت کا خیال ہی نہیں رکھا۔ کلبی کی روایتیں سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ جب مروان محمد بھی شامل ہو جائے تو یہ سلسلہ سرتاپا کذب ہو جاتا ہے۔ [1]

یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر بعض اکابر ائمہ نے تفسیری روایتوں کی صحت کا سرے سے انکار ہی کر دیا چنانچہ امام احمد بن حنبل کا جو جرح و تعدیل کے امام اور بخاری و مسلم کے استاد ہیں قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں مغازی، ملاحم اور تفسیر۔ [2]

ہر چند کہ امام موصوف کے اس قول میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے لیکن ان کے تلامذہ نے کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بیشتر حصہ ان روایات کا ناقابل اعتماد ہے۔ غالباً اس تاویل سے ان کا منشا یہ ہے کہ ائمہ حدیث نے جن تفسیری روایتوں کو اصول حدیث کے عطابق صحیح قرار دیا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جو روایتیں صحیح قرار دی گئی ہیں ان میں بھی تنقید کی ضرورت ہے۔ مثلاً القناطیر المقنطرۃ کی تفسیر میں امام حاکم نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ بارہ ہزار اوقیہ کا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے مگر محدثین نے دونوں کو صحیح کہا ہے۔ [3]

## مکمل تفسیریں:

تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری میں پورے قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں۔ مثلاً تفسیر ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ، تفسیر ابن منذر متوفی ۳۱۸ھ، تفسیر ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ، تفسیر امام حاکم متوفی ۳۹۵ھ، تفسیر بن حیان متوفی ۳۶۹ھ وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک نے صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے علماء سے روایات درج کی ہیں۔ خود اپنی

---

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۹۶ [2] تذکرۃ الموضوعات للشیخ محمد طاہر ص ۸۲

[3] اتقان ج ۲ ص ۱۹۹

طرف سے کوئی بات نہیں لکھی۔ بجز ابن جریر طبری کے جن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر آیت کو نقل کرنے کے بعد اس کے ایک ایک لفظ کے معنی لکھتے ہیں۔ متقدمین کے جو اختلافات ہوتے ہیں' ان کو اسناد کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ پھر خود ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر اس کے وجوہ لکھ دیتے ہیں۔ الفاظ سے گزر کر آیات کے مفہوم کے متعلق بھی ان کا رویہ بعینہٖ یہی ہے۔ کہیں کہیں استنباط مسائل اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔ الغرض ان کی تفسیر اسلام میں پہلی تفسیر ہے جس میں مولف نے اپنی دماغی کوشش اور ذہنی کاوش سے بھی کام لیا ہے اور ہر موقع پر اس کی شخصیت نظر آتی ہے۔ دراصل ان کی تفسیر اس کل قرآنی علم کا مجموعہ ہے جو اس وقت تک علماء اسلام کے پاس تھا۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر طبری جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ امام ابو جامد اسفرائینی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے بھی تفسیر طبری کو حاصل کر لیا تو کوئی بڑی زحمت نہیں اٹھائی۔[1] آج روئے زمین پر پورے قرآن کی سب سے پہلی تفسیر یہی ہے۔ یہ ام التفاسیر بولی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانہ مابعد میں جتنی تفسیریں لکھی گئیں' سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ اس میں خرابی صرف یہ ہے کہ رطب و یابس ہر قسم کی روایات درج کر دی گئی ہیں' لیکن چونکہ سند ہر روایت کی اس کے ساتھ ہے اس وجہ سے جانچنا نہایت آسان ہے۔ امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید حافظ ابن کثیر نے اسی کا خلاصہ تنقیح کر کے اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔

## علمی تفسیریں:

اب تک جتنی تفسیریں لکھی گئی تھی وہ خالص منقولی تھیں' یعنی روایات کا مجموعہ' لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں مختلف قسم کی علمی تحریکات پیدا ہو گئی تھیں' صرف و نحو' بلاغت و معانی' فقہ اصول' منطق و فلسفہ' کلام و تصوف وغیرہ کا عام رواج ہو چکا تھا۔ ان علوم کے حاملین نے جو تفسیریں لکھیں' ان میں بیشتر اپنے فنی زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ علاوہ بریں نئے نئے مذہبی فرقے بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ان اہل مذاہب نے اپنے عقائد و خیالات کے مطابق آیات کی تفسیریں کیں' جن کی وجہ سے اختلافات کی بہت کثرت ہو گئی اور

---

[1] مراۃ التفسیر ص ۴۸

تفسیروں کی نوعیتیں متعدد ہوگئیں۔ مثلاً زجاج اور کسائی وغیرہ نے جو صرف ونحو کے امام تھے اپنی تفسیروں میں خصوصیت کے ساتھ لفظی تصرفات اور وجوہ اعراب سے بحثیں کیں۔

ثعلبی اور ابن اثیر نے جن کو تاریخ کا ذوق تھا' قصص کی تفصیلوں کی طرف رجحان رکھا۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندی اور علامہ قرطبی نے فروعات فقہ پر آیات سے استدلال میں توجہ صرف کی۔ ابومسلم اصفہانی اور زمخشری نے معتزلی عقائد کے اثبات کی کوشش کی۔ اسفرائینی اور رازی نے اشعری اصول کے مطابق متکلمانہ بحثیں لکھیں۔ عبدالقادر جرجانی اور ابوہلال عسکری نے بلاغت ومعنی کے لطائف ظاہر کیے۔ محی الدین ابن عربی اور واحدی وغیرہ نے تصوف کا رنگ بھرا۔ اور شیعہ مفسروں نے آیات کو اپنے مذہبی خیالات کے مطابق بنانے سے سروکار رکھا۔ غرض اس وقت سے لے کر مفتی محمد عبدہ اور سرسید احمد خان تک ہر زمانہ کی تفسیر اس زمانہ کی علمی بحثوں اور تحریکوں سے متاثر اور ہر فرقہ کی تفسیر اس کے عقائد و خیالات کا آئینہ نظر آتی ہے۔

ان وجوہات سے اگرچہ تفسیروں میں وسعت تو بہت پیدا ہوگئی' لیکن بے جا تاویلات کا راستہ بھی کھل گیا اور اکثر فرقوں نے آیات قرآن کو اپنے خیالات کے مطابق اس طرح ڈھالنے کی کوششیں کیں جن کو معنوی تحریف کہنا بجا ہے۔

اس بے اعتدالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تفسیر کے اصول نہیں متعین کیے گئے۔ علماء اصول نے جو کچھ لکھا ہے وہ الفاظ کے استعمال کے متعلق چند عام قیاسی قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ علامہ فناری نے تصریح کی ہے کہ علم تفسیر میں بجز چند امور کے اصول مطلقاً نہیں ہیں' جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو۔ [1]

## شرائط تفسیر:

متاخرین نے مفسر کے لیے کم سے کم پندرہ علوم جاننے کی شرط لگائی ہے' لغت' اشتقاق' صرف' نحو' معانی' بیان' بدیع' قرأت' کلام' اصول دین' اصول فقہ' اسباب نزول' قصص' ناسخ ومنسوخ' فقہ اور حدیث۔ [2]

لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ یہ تمام علوم مسلمانوں میں دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں رائج

---

[1] مراۃ التفسیر ص ۷۔ [2] اتقان ج ۲ ص ۱۸۷۔

ہوئے ہیں، جس سے پہلے ہی قرآن کریم کو حضرات صحابہؓ وتابعین اور تبع تابعینؒ صحیح اور بہتر طریقہ سے سمجھتے رہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان علوم مشروطہ کا ماخذ خود قرآن ہے۔ اسی سے علماء نے ان کو نکالا ہے۔ پھر یہ فہم قرآن کے لیے شرط کیونکر قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ غالباً ان لوگوں کا مقصد جنہوں نے ان علوم کو شرط گردانا ہے، یہ ہوگا کہ ان سے فہم قرآن میں مدد ملتی ہے ورنہ ان میں سے اکثر تو قیاسی علوم ہیں جن میں غلطی کے پہلو بھی نکل آتے ہیں چنانچہ وہ مفسرین جن کی تفسیروں کو علماء نے قابل اعتراض قرار دیا ہے نہ صرف یہ کہ ان علوم سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ اپنی تفسیروں میں ان کے اصول کو مرعی بھی رکھتے تھے۔

## کتب تفسیر:

امام ابن جریر طبری کے بعد جس قدر تفسیریں لکھی گئیں، ان کو کون شمار کرسکتا ہے۔ صرف کشف الظنون میں جو ایک کتب خانہ کی فہرست ہے۔ نوسو تفسیریں نام بنام مندرج ہیں۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اپنی کتاب اکسیر میں اس سے بھی زیادہ تفسیریں گنائی ہیں۔ اگر دنیا کے تمام کتب خانوں میں فہرستیں دیکھ کر ان کی تعداد لکھی جائے تو آج بھی یقیناً کئی ہزار تک پہنچے گی۔ اس موقع پر بہ ترتیب زمانہ چند مشہور تفسیروں کا نام لکھنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

چوتھی صدی ہجری میں تفسیر ابوالحسن اشعری امام اہل سنت متوفی ۳۲۰ھ، تفسیر محمد بن علی اہوفوی متوفی ۳۸۸ھ اس کا نام استغنا فی علوم القرآن ہے اور ایک سو بیس جلدوں میں ہے۔ تفسیر خلف بن احمد والی سیستان متوفی ۳۹۹ھ۔ یہ تفسیر بجستانی کے نام سے مشہور ہے اور سب سے بڑی تفسیر ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں تفسیر ابن فورک متوفی ۴۰۶ھ۔ تفسیر ابن ابوطالب مکی متوفی ۴۳۷ھ۔ تفسیر امام ماوردی متوفی ۴۵۰ھ۔ تفسیر ابومسلم اصفہانی متوفی ۴۵۹ھ، تفسیر امام اسفرائینی متوفی ۴۷۱ھ۔ تفسیر امام الحرمین استاد امام غزالی متوفی ۴۷۸ھ تفسیر راغب اصفہانی متوفی ۵۰۰ھ۔

چھٹی صدی ہجری میں تفسیر امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ جس کا نام یاقوت التاویل ہے اور چالیس جلدوں میں ہے۔ تفسیر امام بغوی محی السنۃ متوفی ۵۱۶ھ۔ تفسیر کشاف جاراللہ زمخشری متوفی ۵۲۸ھ۔ تفسیر امام ابن الجوزی بغدادی متوفی ۵۹۷ھ۔

ساتویں صدی ہجری میں تفسیر امام رازی متوفی ۶۰۶ھ۔ تفسیر شیخ محی الدین ابن عربی متوفی

۶۸۲ھ۔تفسیر سخاوی متوفی ۶۴۳ھ۔تفسیر بیضاوی متوفی ۶۸۲ھ

آٹھویں صدی ہجری میں تفسیر خازن شیخ علاءالدین علی بن محمد بغدادی متوفی ۷۲۵ھ۔تفسیر بحرالمحیط ابوحیان اندلسی۔

نویں صدی ہجری میں تفسیر علامہ مجدالدین فیروز آبادی صاحب قاموس متوفی ۸۱۷ھ۔تفسیر امام بلقینی متوفی ۸۲۴ھ۔

اس کے بعد جو تفسیریں لکھی گئیں' وہ زیادہ انہیں تفسیروں کا خلاصہ یا التقاط ہیں۔ان کے نام گنانے کی ضرورت نہیں۔البتہ ان چند تفسیروں کا ذکر ضروری ہے جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے امتیاز رکھتی ہیں۔ان میں سب سے مقدم ابن جریر طبری کی تفسیر ہے۔جس کی مختصر کیفیت ہم لکھ چکے ہیں۔ہر زمانہ میں اہل علم اسی کو سب سے بہتر تفسیر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔گویا تشویح قرآن کے لحاظ سے وہی پہلی تفسیر ہے اور وہی آخری تفسیر ہے۔آج تک کوئی تفسیر اس کے رتبہ کی نہیں لکھی جا سکی۔

دوسری تفسیر جس نے علماء ادب میں شہرت حاصل کی ہے' کشاف ہے۔اس کے مولف علامہ زمخشری بلاغت و معانی کے امام تھے۔انہوں نے اسی نوعیت سے یہ تفسیر لکھی۔لیکن زیادہ زور پہلے ہی پارہ کی تفسیر میں صرف کر دیا ہے مگر اس میں اپنی فن دانی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔

تیسری تفسیر جو علماء معقول میں مقبول ہوئی امام فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر ہے۔اس میں طویل الذیل فلسفیانہ بحثیں ہیں۔یہ اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جب عالم اسلامی میں منطق' فلسفہ اور علم کلام زیادہ رائج تھا۔اس واسطے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی' لیکن اہل منقول نے اس کو پسند نہ کیا' کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس میں بعض باتیں ان کے قدیم خیالات کے مطابق نہ تھیں۔ان کو آیات کے ساتھ ان متکلمانہ مباحث کا جو ان کے تحت میں لکھے گئے ہیں' ربط نظر نہ آیا' یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے کہہ دیا کہ ''رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے بجز تفسیر کے''

امام رازی نے ربط آیات کی طرف بھی جا بجا اشارات کیے ہیں مگر ہر جگہ اس کا خیال نہیں رکھا ہے۔ان کے بعد علامہ شرف الدین ابوالفضل متوفی ۶۵۵ھ نے اپنی تفسیر میں جو بیس جلدوں میں ہے اور تفسیر مرسی کے نام سے مشہور ہے۔ہر آیت کے باہمی ربط اور اس کے وجوہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی۔اسی عنوان پر شیخ علی مہائمی متوفی ۸۲۵ھ نے جن کا مزار بمبئی میں زیارت گاہ' اپنی تفسیر تبصیر الرحمٰن لکھی۔پھر شیخ ابراہیم بقاعی متوفی ۸۸۵ھ نے تفسیر بقاعی تالیف کی جو فی الجملہ اس سے بہتر سمجھی

گئی۔ اس آخری زمانہ میں مولانا حمید الدین فراہی بھی ربط آیات کے عنوان سے تفسیر نظام الفرقان عربی زبان میں لکھ رہے تھے جو ان کے انتقال کر جانے کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی۔ صرف اس کے بعض اجزا شائع ہوئے ہیں۔ آیات کے علاوہ سورتوں کی ترتیب اور ان کے باہمی تناسب پر شیخ ابو حیان نے اپنی تفسیر البرہان فی مناسبۃ ترتیب سورۃ القرآن لکھی ہے۔

شیخ ابوالفیض فیضی اکبر آبادی متوفی ۱۰۰۴ھ کی تفسیر سواطع الالہام کسی معنوی خوبی کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ غیر منقوط الفاظ میں لکھی گئی ہے۔

موجودہ دور میں شیخ جوہری طنطاوی کی تفسیر مغربی علوم کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ لیکن علمی لحاظ سے بہترین تفسیر شیخ محمد عبدہ کی ہے، جس کی تکمیل ان کے شاگرد رشید علامہ سید رشید رضا مدیر رسالہ المنار مصر کر رہے تھے مگر افسوس ہے کہ ابھی نصف قرآن تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ سید صاحب موصوف انتقال کر گئے اور یہ مفید تفسیر ناتمام رہ گئی۔

نصاب درس کے لیے علماء اہل سنت کو صحت مفہوم اور اختصار دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے سب سے بہتر تفسیر جلالین ملی جو نصف قرآن تک جلال الدین محلی متوفی ۸۶۴ھ اور بقیہ نصف شیخ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی قسم کی مختصر تفسیر مدارک بھی ہے۔ جو علامہ نسفی کی تالیف ہے اور بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصہ سورۃ بقرہ تک بھی پرانے مدارس میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ بیضاوی دراصل تین اہم علمی تفاسیر کا خلاصہ ہے جہاں تک فن بیان کا تعلق ہے، کشاف سے ماخوذ ہے۔ متکلمانہ بحثیں تفسیر کبیر رازی سے اور حقائق ولطائف تفسیر راغب اصفہانی سے لے

## علوم قرآن:

جب سے مسلمانوں میں مختلف علوم کا رواج ہوا اسی وقت سے اہل فن نے قرآن کے ایک ایک شعبہ پر جداگانہ بحثیں شروع کیں۔ اور ان کے متعلق کتابیں تصنیف کرنے لگے۔ مثلاً لغات القرآن، اعراب القرآن، بدائع القرآن، قصص القرآن، احکام القرآن اور حجج القرآن وغیرہ۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں ان علوم کو اسی انواع کا شمار کیا ہے اور ان کے اوپر جو مشہور تصنیفیں ہیں، ان کو گنایا ہے، لیکن دراصل ان انواع کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے اور ہر ایک بجائے

---

لے قضاء

خود ایک مستقل موضوع ہے' جس پر تصانیف کے انبار ہیں' مثلاً الفاظ القرآن' اس پر بہت سے علماء ادب ولغت نے مستقل کتابیں لکھی ہیں' جن میں سے ابوعبیدہ ابوعمر' زاہد اور ابن وردید کی کتابیں مشہور ہیں۔ ان سب کا مجموعہ العزیزی کی کتاب ہے جس کو انہوں نے اپنے استاد ابوبکر ابن الانباری کی معیت میں پورے پندرہ سال کی محنت میں تیار کیا ہے۔ آخر میں راغب اصفہانی نے مفردات القرآن لکھی جو الفاظ قرآن کے متعلق سب سے مفید تر کتاب تسلیم کی گئی ہے۔

اسی طرح اعجاز القرآن پر امام خطابی' رمانی' زماکانی' فخر الدین رازی' ابن سراقہ اور ابوبکر باقلانی کی کتابیں ہیں۔ اس زمانہ میں مصر کے نامور ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب آداب العربیہ کی دوسری جلد پوری اسی عنوان پر لکھی ہے جو سب سے بہتر' جامع اور دل کش تصنیف ہے۔ علیٰ ہذا اقسام القرآن' امثال القرآن' متشابہات القرآن' مبہمات القرآن بلکہ آیات' الفاظ اور حروف قرآن کی تعداد وغیرہ تک کوئی عنوان ایسا نہیں ہے' جس پر تصنیفیں نہ ہوں' یہاں تک کہ خواص القرآن یعنی آیات سے تعویذات' عملیات اور نقوش وغیرہ پر بھی تمیمی' امام غزالی اور یافعی وغیرہ نے کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ قرآنی علوم پر یہ کتابیں مفسروں کے لیے کارآمد ذخیرہ ہیں۔ جن سے وہ اپنی تفسیروں میں مدد لیتے ہیں۔

## نقائص تفسیر:

گزشتہ صفحات میں ان خرابیوں کی طرف جو تفسیروں میں واقع ہوئیں' ضمناً اشارات کیے گئے ہیں۔ اب میں ان کے بڑے بڑے نقائص کو تفصیل وار بیان کر دیتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان مفسروں نے قرآن کی تشریح کے اصول مقرر نہیں کیے۔ علماء اصول نے جو قواعد لکھے ہیں۔ اول تو وہ مخصوص قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر مرتب نہیں کیے گئے ہیں۔ بلکہ عام ہیں اور زیادہ تر ان کا تعلق الفاظ سے ہیں۔ دوسرے ان کی بنا محض قیاس پر ہے۔ جس میں ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش اور غلطی کا احتمال ہے۔ تیسرے وہ صرف چند قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ زمانہ مابعد میں امام ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے اس ضرورت کو محسوس کر کے اصول لکھنے شروع کیے مگر نامعلوم وجوہ سے صرف تمہید ہی لکھ کر رہ گئے۔ آخری زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے اصول تفسیر میں ایک رسالہ فوز الکبیر لکھا۔ لیکن اس میں بعض صرف ایسے مطالب کی مختصر تشریحات ہیں جن سے فہم قرآن میں مدد مل سکتی ہے۔ ان کو اصول نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ محدود ضوابط

نہیں ہیں جن سے کوئی مخصوص طریقہ تفسیر کا متعین ہو سکے۔ بلکہ وہ شاہ صاحب کے فہم قرآن کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہے اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں' حالانکہ سب سے پہلا کام یہی تھا' اس لیے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں چنانچہ ممتاز مفسر علامہ فراہی کا قول نقل کر چکا ہوں کہ تفسیر کے لیے بجز چند معمولی قاعدوں کے اصول مطلقاً نہیں ہیں۔ جن پر اس کی جزئیات کا مدار ہو۔"

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے' یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور خاتمہ تک پہنچا دیتے ہیں' اس طرح آیات اور الفاظ کے معنی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے۔ مگر قرآن سمجھ میں نہیں آتا' یعنی اس کی کوئی تعلیم حل نہیں ہوتی' اس لیے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں' جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں' بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول و عرض میں بتدریج اتاری گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی خاص مسئلے کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے اس مسئلے کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لہذا ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ بہ سلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں' قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہو سکتی۔ فہم قرآن کے لیے تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فن طب میں کتب مفردات کی ہے' جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے۔ خواص' آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہو سکتا۔ بجنسہ اسی طرح ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائق قرآنی کا عالم نہیں ہو سکتا۔

(۳) اکثر تفاسیر میں آیات و الفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں اور تفسیری روایات کی بابت ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے چنانچہ امام احمد بن حنبل نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منتہی ہوئی کہہ دیا ہے کہ تفسیری روایتیں تمام تر بے اصل ہیں۔ قصص میں اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر ناقابل اعتبار ہیں۔ یہی حال اسباب نزول کی روایتوں کا ہے۔ قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے مسئلہ اسناد بھی لکھے تھے جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز بھی ہو سکتی تھی مگر

متاخرین نے ان کو بھی حذف کر دیا اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے، جس کے باعث عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہوگئی اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہوگئیں۔ یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی اسی قدر مسلمانوں کو قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بعد ہوتا گیا۔

(۴) ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ بعض بزرگ تو اس قسم کے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں، یعنی تقرباً الی اللہ خدام قرآن میں داخل ہو گئے ہیں۔ بجز اس کے کہ ان تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی۔ جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لیے مغفرت و دعاء نکلے یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ اپنے پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہوگئیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ جس کو قرآن نے سکھلایا ہے کہ "وَاَمَّا مَایَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ"۔ وہی چیز دنیا میں رہے گی جو لوگوں کے لیے نفع رساں ہوگی۔

جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے ان میں اکثر ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے خاص خاص عقیدوں کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے محض جدت طبع دکھائی ہے۔ مثلاً ابن فورک نے حضرت ابراہیم کے قول لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے یا "کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ" کی تفسیر میں بعضوں نے کہا ہے کہ سجل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام تھا، حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کے کوئی صحابی نہیں ہیں۔ یا "مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ" کی تفسیر علی و فاطمہ اور "لؤلؤ و مرجان" کی تفسیر حسنین رضی اللہ عنہم یا "اَلصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْمُنْفِقِیْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ" کی تفسیر میں صابر سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ صادق سے صدیق۔ قانت سے عمر فاروق۔ منفقین سے عثمان غنی اور مستغفرین سے حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ غرض اسی طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جو ان حضرات نے مسخ کی ہیں۔[1] ایسی تفسیروں سے سوائے انسانی تخیلات کے آسمانی پیغام کی ماہیت نہیں سمجھی جاسکتی۔

---

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۴

(۵) یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تو کوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں۔ غرض اس نسخ کے عقیدے نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔[1]

(۶) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں مثلاً غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کی تفسیر میں دس قول ہیں۔ وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ کی متعدد تفسیریں ہیں۔ وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی۔ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں جن کی کئی کئی تفسیریں یا۔ یا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو حزم و یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ صحیح مفہوم کے فیصلے کی قوت ان کے اندر مفقود ہوتی ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کی توضیح ہو وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

(۷) ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ جنت کا ذکر ہے تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد کا شمار اور کوثر اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے۔ جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے ان کے چہروں، گھوڑوں اور عماموں رنگ اور ان کی شہسواری و حملہ و قتال کی کیفیت لکھیں گے۔ یاجوج ماجوج کے تاریخی حالات سے بحث نہیں کریں گے۔ بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت سے مشابہ ہیں جو ملک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ایک سو بیس گز ہوتی ہے اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اوڑھنا ہے اور دوسرا بچھونا۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں الجھ جائیں گے۔

---

[1] نسخ کی مفصل بحث ہماری کتاب تاریخ القرآن میں ہے۔

یہ سات بڑے بڑے عیوب واسقام جو میں نے گنائے ہیں' ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ موجودہ تفسیروں میں سے شاید ہی کوئی تفسیر ان سے خالی ہو۔ ان کے علاوہ اگر ان تفاسیر کی چھوٹی چھوٹی جزئی خرابیوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ حد شمار سے باہر ہیں۔

## قرآن:

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ قران کامل کتاب اردین کا مستقل دستورالعمل ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ اللہ نے اس کو "نور مبین" کہا ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔ (۴/۱۷۵)

اور ہم نے جگمگاتا نور تمہاری طرف اتارا۔

نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور اردگرد کی چیزوں کو بھی روشنی دیتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے۔ وہ واضح' کھلا ہوا اور روشن ہے اور اپنے مطالب کی تشریح آپ کر دیتا ہے۔ اس کی تلاش کے لیے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں۔ جیسے آفتاب کو چراغ سے نہیں ڈھونڈا جاتا۔ وہ دین و دنیا کے ان تمام حقائق کو جن سے انسان کو ہدایت ملتی ہے اور قدیم آسمانی کتب کی جملہ ابدی تعلیمات کی توضیح اور تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ (۱۶/۸۹)

اور ہم نے تیرے اوپر کتاب اتاری جو ہر شے کی تشریح اور مسلمانوں کے لیے ہدایت' رحمت اور بشارت ہے۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۲/۱۱۱)

یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۱۰/۲۷)

اور یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کو بنالے بلکہ یہ اپنے سے پہلی آسمانی کتب کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔ یہ رب العلمین کی طرف سے ہے۔

آیت بالا میں "الکتب" سے مراد علم الٰہی ہے جس کو قرآن نے جابجا اسی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتَابٍ۔ (۲۲/۶۹)

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ان سب چیزوں کا علم رکھتا ہے جو آسمان و زمین میں ہیں' بے شک وہ لکھی ہوئی ہیں۔

وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ط (۴/۵۹)

وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کا علم رکھتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہے اور جو کچھ خشک و تر ہے وہ سب کتاب مبین (علم الٰہی) میں ہے۔

اسی کتاب مبین کو اللہ نے عربی قرآن بتایا:

وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِo اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۴۳/۲)

اور کتاب مبین شاہد ہے کہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا تا کہ تم سمجھو۔

کتاب مبین صحیفہ فطرت اور علم الٰہی ہے اور قرآن کریم قول الٰہی اور یہ تینوں متحد ہیں۔ جس طرح صحیفہ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے اسی طرح قرآنی حقائق کو بھی کوئی انتہا نہیں ہے اور انسانی نسلیں ابدالآباد تک بھی ان کو ختم نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیشہ کے لیے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔

مزید توضیح کے لیے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں اس قدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریب اور شک کے ان دونوں میں امتیاز کر لیتا ہے۔ مثلاً زمین' دریا' پہاڑ اور جنگل کو دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہو جاتا ہے کہ یہ فطری چیزیں ہیں۔ اور اگر زمین پر کوئی عمارت یا دریا میں کوئی کشتی یا پہاڑ میں کوئی بت یا جنگل میں کوئی گاڑی نظر آئے تو ہر شخص

بلا کسی اشتباہ کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے۔

درخت پر سے گرا ہوا ایک پتہ' گھاس میں سے اڑا ہوا ایک تنکا' چیونٹی کا ٹوٹا ہوا ایک پانو اور بھڑ کا جھڑا ہوا ایک رواں اگر سارے عالم کے ماہر اور کاری گر جمع ہو کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہی فرق اللہ کے کلام اور انسان کے کلام میں ہے۔

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْ بِمِثْلِ هٰذَاالْقُرْاٰنَ لَایَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا. (۱۷/۸۸)

کہہ دے کہ اگر سارے جن وانس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے۔ اگر چہ وہ ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

لیکن معنوی حقائق چوں کہ عقلی چیزیں ہیں اس لیے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہی امتیاز قرآن کا وہ زندہ معجزہ ہے جو جاودانی ہے اور اہل بصیرت پر سورج کی طرح نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے فصاحت و بلاغت کے قاعدوں سے آیات الٰہی کا اقوال انسانی کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ کر کے اعجاز دکھانے کی کوشش کی ہے اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کس بے بصری میں مبتلا تھے۔

دوسرا فرق مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں یہ ہے کہ فطرتی اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی حد معین نہیں کی جا سکتی بلکہ ان کے متعلق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں۔ اسی قدر ان کے افعال وخواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے کہ وہ مخصوص غرض و غایت کے لیے بنائی جاتی ہیں اور ان سے وہی نفع لیا جاتا ہے جس کو پہلے سے پیش نظر رکھ کر وہ بنائی گئی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول' ایک زمان یا ایک مکان کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر ماحول' ہر زمان اور ہر مکان کے لیے ہے۔ حقائق فطرت کے متعلق جس قدر انسان کا علم بڑھتا جائے گا' اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے اور وہ فطرتی اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا یا تھک جانے والا نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں اور ان کی غرض معین۔

جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ عہد صحابہ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا اور اب ہم کو انہیں کی فہم پر قناعت کر لینی چاہیے' وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا علم قرآنی اس لحاظ

سے افضل ہے کہ انہوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا' یعنی جو کچھ سمجھا' یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا' اس کی پوری تعمیل کی اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے بلکہ عملی بھی ہے اور اس کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے ہی فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے صحابہ کا درجہ عملی لحاظ سے اس قدر افضل ہوا کہ ساری امت مل کر بھی ان کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی' مگر جو لوگ فہم قرآن کو ان روایات میں الجھانا چاہتے ہیں جو صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی مخصوص ماحول کی کتاب نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے دینی نصاب اور ہر زمانہ کی ضروریات قرآن ہی کی روشنی میں حل کی جائیں گی۔

علاوہ بریں جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس قدر غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کی تشریح کا مدار ان کے اوپر رکھنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوئی تھیں' لوگ ان کے شان نزول سے واقف تھے اس لیے ان کو اچھی طرح سمجھ لیا' دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شان نزول' موقع نزول یا واقعہ نزول کا پابند نہیں ہے اور اس کی ہدایت مخصوص زمان و مکان سے قطعاً وابستہ نہیں ہیں بلکہ بالاتر ہیں۔

ہماری تمام تفسیریں آغاز عہد سے اب تک یعنی امام ابن جریر طبری سے مفتی محمد عبدہ تک اسی قدامت پسندی کے نظریہ کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور ان کا انداز بھی شروع سے لے کر آج تک ایک ہی ہے' یعنی سلسلہ بہ سلسلہ آیات کے چلتی ہیں۔ اس طرح آیات و الفاظ کی تشریح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآنی مسائل اور حقائق سمجھ میں نہیں آ سکتے کیونکہ وہ مسلسل نہیں بیان کیے گئے ہیں۔ بلکہ مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اس لیے جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں' قرآن فہمی کے لیے یہ تفسیریں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ان تمام تفسیروں کا مفید حصہ جو ہو سکتا ہے وہ تقریباً اسی قدر ہے جس کو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں جمع کر دیا ہے۔ بقیہ جو کچھ ہے وہ سلف کی آیات فہمی کی تاریخ ہے اور بس۔ اس میں سے ہم صرف اسی قدر لے سکتے ہیں جو قرآنی تشریح کے مطابق نکل آئے۔

## اصولِ قرآن:

اب ہم خود قرآن کریم ہی سے فہم قرآن کے وہ اصول بیان کرتے ہیں جو ہم نے اس سے اخذ کیے ہیں' کیونکہ قرآن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں مستقل اور مکمل کتاب ہے جو اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس کے اصول بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور کسی بات میں بھی کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ نے حکم دیا ہے:

اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ لَاتَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَاءَ- (۷/۳)

اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

(۱) قرآن فہمی کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی جس حقیقت کی تفصیل مطلوب ہو وہ قرآن ہی سے نکالی جائے۔ کیونکہ قرآن کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے:

ثُمَّ اِنَّا عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹)

پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

قرآنی تصریح کے مطابق اس کی بیشتر آیات محکمات ہیں یعنی ان کے معانی قطعی اور متعین ہیں اور تھوڑی سی متشابہات ہیں جن کے حقائق انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات' صفات' جنت' دوزخ' بعث ونشر اور میزان عمل وغیرہ جن کو تمثیل وتشبیہ کے طور بیان کیا گیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔ ان آیات متشابہات کے اوپر صرف ایمان کا مطالبہ ہے نہ کہ عمل کا۔ اس وجہ سے ان کی تفصیل مطلوب نہیں ہے۔ البتہ محکم آیات جو ام الکتاب اور اصل قرآن کہی گئی ہیں' ان کی تفصیل سمجھنے کی ضرورت ہے اور وہ اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہے:

کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ - (۱۱/۱)

یہ مکمل کتاب ہے جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے:

وَلَقَدْ جِئْنَا ھُمْ بِکِتٰبٍ فَصَّلْنٰہُ عَلٰی عِلْمٍ. (۷/۵۲)

ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

یہ تفصیل اہل علم وفہم کے لیے ہے:

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۶/۹۸)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لیے کی ہے جو علم رکھتے ہیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۶/۹۹)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لیے ہے جو فہم رکھتے ہیں۔

جس قدر انسان کا علم حقائق فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا اسی قدر وہ آیات قرآنی کی تفصیلات زیادہ سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اگر فہم معانی میں اختلافات واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ جس طرح امور فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہو جاتا ہے لیکن مزید غور وفکر سے رفتہ رفتہ آخر کار وہ مٹ جاتا ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الخیال ہو جاتے ہیں۔

قرآنی آیات جو اکثر بہ تبدیل الفاظ وعبارات جا بجا الٹ پھیر کے بیان کی گئی ہیں ان میں ان کی تشریح مضمر ہے:

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۶/۱۰۶)

اور یوں ہی ہم آیات کو ہیر پھیر کے لاتے ہیں کہ وہ کہہ دیں کہ تو نے پڑھ کر سنا دیا اور تا کہ ہم اہل علم کے لیے تشریح کر دیں۔

الغرض قرآن کریم کی تفصیل خود قرآن ہی میں ہے اور وہ مفصل کتاب ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا. (۶/۱۱۵)

اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ۔

اس لیے تفسیر قرآن کی صورت یہ ہے کہ جس طرح علماء فطرت اور اس کے حقائق کے مفکرین اپنی علمی تحقیق کے لیے ایک خاص شعبہ کو جس میں ان کو مہارت ہوتی ہے مخصوص کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو علوم صحیحہ میں سے کسی علم کے ماہر ہوں قرآن کی ان مخصوص آیات کی تفصیل کو جو ان کے علم سے تعلق رکھتے ہیں اپنے ذمہ لیں اور ان پر علمی بصیرت کے ساتھ غور وفکر کریں۔ اس طرح پر قرآن کی تفصیل ہوتی جائے گی اور عالم فطرت کی طرح اس کے حقائق بھی آشکارا ہوتے جائیں گے۔ ہاں علم

کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

بے شک قرآن سے نصیحت لینا اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا عوام کے لیے بھی سہل ہے۔ جس طرح کہ عالم فطرت کی نعمتوں سے متمتع ہونا جاہلوں کے لیے بھی آسان ہے' مگر عالم فطرت پر غور کرنے والوں نے ہزار ہا چیزیں جو ایجاد کی ہیں' وہ ان کی فہم سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح قرآنی حکمت اور حقیقت تک رسائی علوم صحیحہ کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ قرآن کی موجودہ تفسیروں سے جو آج تک ہوئی ہیں صرف الفاظ اور آیات کے معانی حل ہوتے ہیں اور بے شک یہ بھی ضروری اور ابتدائی چیز ہے لیکن کسی قرآنی حقیقت کی تفصیل کے لیے سارے قرآن کو چھاننا پڑے گا۔ اس لحاظ سے ابھی تک قرآن پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

(۲) آیات کی تشریح میں روایات سے مدد لی جا سکتی ہے' لیکن ان کے اوپر تفسیر کا مدار نہیں رکھا جا سکتا ہے جیسا کہ آج تک عام طور پر لوگ کرتے آئے ہیں' کیونکہ روایات غیر یقینی اور ظنی ہیں۔ تاریخ تفسیر میں ہم امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کر چکے ہیں کہ تفسیری روایتیں بوجہ ضعف رواۃ کے بے اصل ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ صحاح ستہ میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں لیکن ان پر نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں چنانچہ تفسیر بالروایت کے نام سے ایک مقالہ میں صحاح ستہ کی تفسیری روایتوں سے ہم نے بہت سی مثالیں نکال کر پیش کر دی ہیں جو علم و عقل اور خود قرآن کے بھی خلاف ہیں اور ہرگز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی تفسیریں نہیں ہو سکتیں۔

(۳) تفسیر بالروایت ہی کی ایک شاخ اختلاف قرأت بھی ہے' یعنی مفسروں نے بعض آیات کے الفاظ میں شاذ قراتوں سے اضافے کر لیے ہیں۔ مثلاً:

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ. (۴/۱۱)

اور اگر ایک مرد ہو جو وارث بنایا جائے کسی کلالہ کا یا ایک عورت اور اس کلالہ کے ایک بھائی یا بہن ہو تو (اس مرد یا عورت میں سے) ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

یہاں اخ اور اخت کے الفاظ کو جو بلا قید بیان کیے گئے ہیں اخیافی بھائی اور بہن کے لیے مفسروں نے مخصوص کر دیا ہے اس بنیاد پر کہ بعض صحابہ کی قرأت میں "اَخٌ اَوْ اُخْتٌ لِاُمٍّ" مروی ہے۔ اس وجہ

سے فقہا نے اخیافی بھائی بہن کو ذوی الفروض میں داخل کر لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وراثت کے اصول میں بدیہی غلطیاں واقع ہو گئیں' یعنی اخیافی بھائی بہنوں کی وجہ سے بعض صورتوں میں حقیقی بھائی بہن محروم ہونے لگے مثلاً: زیرین مسئلہ

۳۔شوہر ۱۔ماں ۲۔دو اخیافی بھائی دو حقیقی بھائی

یہ کیسے عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ ماں اور باپ دونوں کی اولاد یعنی سگے محروم بھائی تو محروم رہیں اور صرف ماں کی اولاد ترکہ لے لے' جن کو ممکن ہے کہ غیر خاندان سے وہ لائی ہو۔ کیا یہ کھلی ہوئی غلطی نہیں ہے جو قرآن کریم کے سر تھوپی جا رہی ہے محض روایت کی بدولت۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں قرآن نے بہن اور بھائی کا حصہ ہی نہیں بیان کیا ہے بلکہ رجل وامرۃ یعنی مذکر ومونث عہدی وارثوں کا حصہ ہے۔ اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی عربی کتاب ''الوارثۃ فی الاسلام'' میں بیان کر دیا ہے' جو جامعہ ملیہ کے مطبع سے شائع ہو چکی ہے۔

درحقیقت شاذ قراتیں قرآن پر اضافے ہیں جو کسی طرح تسلیم کے قابل نہیں ہیں۔ کیونکہ قرآن کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کا محافظ ہے' ہمارا ایمان اسی قرآن پر ہے جو بین الدفتین محفوظ ہیں۔

(۴) قرآن کریم کے الفاظ جس حد تک لے چلیں اس سے آگے مطلق قدم نہ بڑھایا جائے' کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنے معنی کے لحاظ سے اپنی جگہ پر کامل اور مقصود کے مطابق ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا. (۶/۱۱۶)

اور تیرے رب کے الفاظ سچائی اور (معنی کی) برابری کے لحاظ سے پورے ہیں۔

ان کلمات سے آگے بڑھنے میں قرآنی حدود سے تجاوز لازمی ہے جو بڑی غلطیوں کا موجب ہو سکتا ہے مثلاً:

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ط اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۱۵/۲۳)

اور ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں۔ ہم تم میں سے آگے جانے والوں کو بھی جانتے ہیں اور پیچھے آنے والوں کو بھی۔ بے شک تیرا رب ان کو

حشر میں جمع کرے گا وہ علم وحکمت والا ہے۔

مستقدم اور متاخر کے الفاظ قرآن میں کئی جگہ پہلے اور پیچھے مرنے والوں کے لیے مستعمل ہوئے ہیں۔ مثلاً:

اِذْجَاءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰/۲۹)

جب ان کی اجل آجائے گی تو ایک گھڑی نہ وہ پیچھے رہیں گے نہ آگے بڑھیں گے۔

یعنی اپنے وقت معینہ پر ان کی ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ اس لیے قرآن کی تفصیل کے مطابق "وَلَقَدْ علمنا المستقدمين' الآيه" کے معنی یہ ہوئے کہ تم میں سے جو لوگ پہلے گزر گئے اور جو بعد میں مریں گے۔ ان سب کا ہم علم رکھتے ہیں اور حشر کے دن ان سب کو جمع کریں گے۔

لیکن بعضوں نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایک حسین ترین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز جماعت پڑھنے کے لیے مسجد میں آیا کرتی تھیں۔ کچھ لوگ آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں اور کچھ پیچھے کی صف میں رہ جاتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل میں سے اس کی طرف جھانکتے تھے۔ ان ہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اب یہ معنی نکالنے کے لیے آیت میں پہلی صف اور پچھلی صف کے الفاظ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جو اصولاً جائز نہیں۔ پھر صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت پر ایسا مکروہ الزام عائد ہوتا ہے' جس کو کوئی شخص جو ان کے حالات سے واقف ہے' تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ روایت اگرچہ صحاح ستہ کی تین کتابوں ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ میں ہے لیکن خود قرآنی تفصیل کے مخالف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے۔

(۵) جہاں تک زبان کا تعلق ہے' قرآن کی عربی آسان اور واضح ہے' جس میں کوئی پیچیدگی نہیں:

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ. (۲۶/۹۵)

واضح عربی زبان میں

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹/۲۸)

عربی قرآن جس میں کوئی کجی نہیں۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ (۴۴/۵۸)

ہم نے تو اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان بنا دیا ہے۔

لہذا قرآن کے الفاظ کے معنی وہی لیے جائیں گے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں۔

اہل لغت نے الفاظ کے جو معانی لکھے ہیں ان کی بنیاد سماع پر ہے اور کتب لغت کی تدوین جس وقت ہوئی ہے اس وقت تک بہت سے الفاظ کے مخصوص معانی تفسیر، حدیث اور فقہ میں رائج ہو چکے تھے وہی لغات میں درج ہوئے۔ اس لیے لغت اگرچہ مسلم ہے، مگر وہ حتمی دلیل نہیں ہے۔ اگر قرآنی الفاظ کے معانی میں اختلاف واقع ہو تو خود قرآن سے ان کا تعین ہو سکتا ہے۔

اصول و قواعد لسانی کی ترتیب و تدوین بھی نزول قرآن کے مدتوں بعد ہوئی بلکہ ان کا بڑا حصہ ائمہ فن نے خود قرآن ہی سے اخذ کیا ہے، لہذا یہ اصول قرآن پر حاکم نہیں ہو سکتے۔ اگر قرآن میں کوئی لفظ ان اصول کے مطابق نہ اترے تو سمجھنا چاہیے کہ جن لوگوں نے اصول استنباط کیے ان سے کمی رہ گئی۔

(۶) ایک اہم اصول قرآنی فہمی کا یہ ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲)

اور اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس لیے کسی آیت کی ایسی تفسیر نہیں کی جا سکتی جو دوسری کسی آیت کے خلاف پڑتی ہو۔ مثلاً

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَآءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَالَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ. (۱۰/۱۸)

عام مفسروں نے آیت بالا میں "لا یعلم" کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے، یعنی اللہ کی طرف لاعلمی منسوب کی ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بھی ان کی تتبع میں اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے:

"اور پوجتے ہیں اللہ سے نیچے جو چیز نہ برا کرے نہ ان کا بھلا کرے اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس تو کہہ کہ تم اللہ کو جتاتے ہو جو اس کو معلوم نہیں کہیں آسمانوں میں نہ زمین میں۔"

یہ تفسیر یا ترجمہ علاوہ اس کے کہ جسارت ہے جو کسی مسلمان کے لیے زیبا نہیں براہ راست خود قرآنی تصریح کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۲۹/۴۲)

جس شے کو بھی وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں اللہ اس کو جانتا ہے۔

پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہ مشرکین اللہ کو اپنے باطل معبودوں کی خبر ہرگز نہیں دیتے بلکہ ان کے توسط سے خود اپنی حاجتوں کی خبر اللہ تک پہنچانا چاہتے ہیں اور یہی معنی ان کو سفارشی بنانے کے ہیں' ورنہ اگر وہ اللہ کو اپنے معبودوں کی خبر دیتے تو خود اپنا حال بھی اس سے کہہ سکتے تھے۔ بیچ میں سفارش کی کیا ضرورت تھی؟ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع ۔۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو آسمانوں اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں ہے۔

(۷) پہلے اشارہ گزر چکا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں نسخ کے عقیدہ نے بہت خرابیاں پیدا کی ہیں۔ مفسرین تین قسم کے نسخ کے قائل ہیں:

(۱) وہ آیات جن کا حکم بھی منسوخ ہو گیا اور وہ پڑھی لکھی بھی نہیں جاتیں۔

یہ نسخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب کہ قرآن نازل ہو رہا تھا واقع ہوا ہے۔ اب چونکہ نہ وہ آیتیں باقی ہیں نہ ان کے احکام' اس لیے ان پر بحث بھی غیر ضروری ہے۔

(۲) وہ آیات جن کا حکم منسوخ نہیں ہوا' لیکن تلاوت منسوخ ہو گئی۔

نسخ کی یہ قسم دوم عقل کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اگر حقیقت میں ایسی کوئی آیت ہوتی تو ناممکن تھا کہ اللہ اس کی حفاظت نہ کرتا۔ اس نسخ کے مدعی آیت رجم کو مثال میں پیش کرتے ہیں' لیکن اگر واقعی آیت رجم نازل ہوئی ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن میں درج ہونے سے رہ جاتی۔ یہ روایت حضرت عمرؓ سے کی گئی ہے جو خود جمع قرآن میں شریک تھے۔ پھر کیا چیز مانع تھی جو انہوں نے اس کو نہ لکھوایا؟ علاوہ بریں چونکہ یہ روایت قرآن کے صریح آیت "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کے خلاف ہے اس لیے ہرگز تسلیم کے قابل نہیں ہے' خواہ اس کے راوی جبریل و میکائیل ہی کیوں نہ بتائے جائیں۔

(۳) وہ آیات جن کا حکم منسوخ ہو گیا ہے مگر تلاوت نہیں منسوخ ہوئی۔

اس قسم سوم میں لوگوں نے رائے اور قیاس کو اس قدر دخل دیا ہے کہ سینکڑوں آیتوں پر نسخ کا

حکم لگا دیا ہے۔ علامہ ابن عربی نے اس تعداد کو کم کر کے ۲۱ آیتوں کو منسوخ تسلیم کیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان میں ذرا اور غور کیا تو ان کے نزدیک صرف پانچ آیتیں منسوخ ثابت ہوئیں، ہمارے نزدیک وہ بھی منسوخ نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دلائل کے ساتھ اپنی کتاب تاریخ القرآن میں لکھ دیا ہے۔

ان باتوں سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ آیات کو جن لوگوں نے منسوخ کہا ہے محض اپنی رائے اور قیاس سے کہا ہے اور اللہ کا کلام اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ کسی انسان کی رائے سے منسوخ ہو سکے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ قرآن کے ایک لفظ کو بھی بدل سکیں۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِيْ (۱۰/۱۵)

کہہ دے کہ مجھے حق نہیں ہے کہ اس کو اپنے جی سے بدل سکوں۔

جن آیات کو لوگوں نے منسوخ قرار دیا ہے، ان کے متعلق ہم کو یقین ہے کہ وہ قرآن کی احکامی آیتیں ہیں۔ اللہ نے ان کو نازل فرمایا ہے اور رسول اللہؐ نے ان کو یاد کرایا اور قرآن میں لکھوایا ہے۔ اب سوائے اللہ کے دوسرا کون ہے جو اس کو منسوخ کر سکتا ہے؟ اگر کسی کو دو آیتوں میں باہمی تعارض نظر آتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک کو منسوخ قرار دیتا ہے تو یہ اس کی فہم کا قصور ہے کیونکہ قرآن نے تصریح کی ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے------ لہٰذا قرآن کی موجودہ آیتوں میں سے ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔

اور جن لوگوں نے روایات سے آیات کو منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے مثلاً:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ. (۲/۱۸۰)

تمہارے اوپر فرض کیا گیا کہ تم میں سے جب کسی کی موت کا وقت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو والدین اور اقرباء کے لیے وصیت کر جائے۔ یہ اللہ سے ڈرنے والوں پر ایک حق ہے۔

صریح الفاظ میں اللہ نے مال داروں پر ورثہ کے لیے وصیت فرض کی اور متقیوں پر اس کو لازمی قرار دیا اور موکد فرمایا۔ پھر آیت وراثت میں بھی چار جگہ "من بعد وصیة" فرمایا کر توضیح کر دی کہ توریث کا اجراء وصیت کے نفاذ کے بعد ہوگا، مگر فقہاء نے "الا لا وصیة لوارث" (یاد رکھو کسی وارث کے

لیے وصیت نہیں ہے) کی روایت سے اس موکد آیت کو منسوخ کر ڈالا اور یہ نہ سمجھ سکے کہ وصیت ورثہ کی شخصی مصلحتوں کے لیے ہے' جو توریث میں ممکن نہیں ہے' کیونکہ ورثہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص کے دو بیٹے ہیں' جن میں سے ایک پر اس نے ہزاروں روپیہ خرچ کر ڈالا ہے اور پڑھا لکھا کر اس کو اس قابل بنا دیا ہے کہ خوب کماتا ہے اور باپ کی دولت سے مستغنی ہے اور دوسرا بیٹا ہے جو آج پیدا ہوا ہے۔ وراثت کا قانون کلی ہے وہ شخصی مصلحت کا لحاظ نہیں کرے گا اور دونوں کو برابر حصہ دے گا' مگر خانگی اور عائلی مصالح کا تقاضا اس کے خلاف ہے۔ اسی قسم کے مخصوص حالات کے لیے وصیت فرض کی گئی ہے تاکہ مورث اپنے ورثہ کی مناسب ضروریات کا لحاظ رکھ سکے۔ ایسی اہم اور موکد آیت کو فقہا صرف خبر احاد سے منسوخ کر ڈالا۔ اور قرآن کی سکھائی ہوئی مصلحت کو ضائع کر دیا۔

یہ ہیں وہ موٹے موٹے چند اصول جو ہم نے قرآن سمجھنے کے لیے خود اسی سے اخذ کیے ہیں۔ ان کے علاوہ ضرورت پڑنے پر مزید اصول بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ ان اصول کے مطابق قرآن کریم کی تعلیمات کی تشریح عنوانات متعین کر کے ہی کی جا سکتی ہے اور ہم نے اپنا طریقہ یہی رکھا ہے۔ ہماری کتاب تعلیمات قرآن اور چودھری غلام احمد خاں پرویز بی اے کی معارف القرآن اسی نہج پر لکھی گئی ہیں۔

# تفسیر بالروایت

ائمہ حدیث نے حدیثوں کی رو سے تفسیر بالرائے کو تو حرام قرار دیا ہے لیکن تفسیر بالروایت کے طریق کو محفوظ خیال کیا ہے حالانکہ روایت سوائے متواتر کے خواہ کسی درجہ کی ہو' ظن سے آگے نہیں بڑھتی۔ علاوہ بریں تفسیر میں جو روایتیں ہیں' ان کے متعلق خود ائمہ حدیث کی شہادت ہے کہ وہ بالعموم ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المومنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں' ان کا قول ہے کہ:

''تین کتابیں ہیں جن کا کوئی اصلیت نہیں' ملاحم' مغازی اور تفسیر''

عام خیال یہ ہے کہ ''صحاح ستہ'' میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں مگر ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے اس قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ چنانچہ میں صحاح ستہ سے تفسیر بالروایت کی چند مثالیں نکال کر پیش کرتا ہوں' جن میں سے کچھ تو خود قرآن کے مخالف ہیں۔ کچھ دوسری حدیثوں سے متعارض اور بعض علم و عقل کے خلاف' جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تفسیریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرگز نہیں ہو سکتیں۔

وَاِذْقَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اَرِنِىْ كَيْفَ تُحْىِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ (۲/ ۲۶)

اور جب کہا ابراہیمؑ نے کہ اے میرے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا تو ایمان نہیں لایا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا بے شک (میں ایمان لایا ہوں) لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔

اس کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیح بخاری میں یہ روایت درج کی گئی ہے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ابراہیمؑ سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں جبکہ انہوں نے کہا کے اے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

یہ روایت قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ کیونکہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی تصریح کر دی ہے اور وہ بھی "بلٰی" کے لفظ کے ساتھ یعنی بے شک میں مومن ہوں اور ایمان نام ہے علم الیقین کا جس میں کوئی شائبہ شک کا نہ ہو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا. (۴۹/ ۱۵)

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے شک نہ کیا۔

چہ جائیکہ حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم رسول کا ایمان اللہ کے مردوں کے زندہ کرنے پر جو بادشاہ سے اسی مسئلہ پر بحث کر چکے تھے' جس کا ذکر اس سے پیشتر کی آیات میں ہے۔ ان کو اس کے اوپر علم الیقین اور ایمان کامل حاصل تھا۔ وہ چاہتے تھے صرف اطمینان اور عین الیقین' نہ کہ کسی شک کا ازالہ۔ مگر یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو شک تھا۔

اور عقل کے خلاف اس وجہ سے ہے کہ جب دنیا کے دو سب سے بڑے پیغمبروں میں سے ایک کو اللہ کی صفت احیاء اموات میں شک ہو اور دوسرا اپنے آپ کو ان سے بھی زیادہ شک کا حق دار سمجھے تو پھر ایمان اور یقین کس کے اندر تلاش کیا جائے گا۔

(۲) اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا. (۲۲/ ۱)

بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے۔ جس دن تم اس کو دیکھو گے اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو جسے اس نے دودھ پلایا ہے بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل جن دے گی۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کا زلزلہ اس قدر ہولناک ہوگا کہ اس کو دیکھتے ہی دودھ پلانے والیاں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور حمل والیوں کے حمل مارے خوف کے گر جائیں گے' لیکن اس کی تفسیر روایت میں یوں ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن آدم سے کہے گا کہ تم اپنی

ذریت میں سے جہنم کا حصہ نکالو۔ وہ کہیں گے کہ کس قدر؟ جواب ملے گا کہ ایک ہزار میں سے ۹۹۹۔ اس وقت حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے۔

یہ خلاصہ ہے بخاری کی روایت کا اور یہی ترمذی میں بھی ہے مگر یہ تفسیر قرآن کے بالکل منافی ہے کیونکہ قرآن میں ذہنوں اور وضع حمل کی علت زلزلہ کی ہولناکی ہے اور اس روایت میں جہنم کا حصہ نکالنے کے حکم کی گرانی۔ قرآن میں اس کا وقت ہے "یوم ترونھا" جس دن تم زلزلہ کو دیکھو گے اور روایت میدان قیامت میں محاسبہ کا وقت اس کے لیے معین کرتی ہے' جہاں کسی زلزلہ کا ثبوت نہیں۔

پھر یہ میدان قیامت میں ہر قسم کے مونث جان داروں میں حمل کس وقت کے ہوں گے جو گریں گے اور وہاں ان کے اسقاط حمل کی غرض وغایت کیا ہوگی؟ اگر اس کو مجازاً محض شدت خوف کا استعارہ سمجھا جائے تو جب حقیقی معنی بن سکتے ہیں تو مجازی معنی لینے کی کیا ضرورت ہے؟

آیت سے ذہن جس امر کی طرف متبادر ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ یہ حالت دنیا میں نفخ صور اول کے وقت ہوگی جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ستارے ٹوٹ پڑیں گے زمین میں بھونچال آئے گا اور شور برپا ہوگا' لیکن یہ روایت اس کو نفخ صور دوم کے بعد میدان قیامت کا حال قرار دیتی ہے جو آیت کے سراسر خلاف ہے اس لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہرگز نہیں ہوسکتا۔

(۳) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ (۱۷/۱۰۱)

اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر روایت کے ساتھ اس طرح کی گئی ہے:

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سامنے سے دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا لے چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئی تھیں؟ آپؐ نے فرمایا وہ یہ ہیں (۱) کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ (۲) زنا نہ کرو (۳) کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو (۴) چوری نہ کرو (۵) جادو نہ کرو (۶) کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ (۷) سود نہ کھاؤ (۸) کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ (۹) اور میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لیے اے یہود! دسواں حکم یہ ہے

کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔ یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی' مسند امام احمد' نسائی' ابن ماجہ اور ابن جریر میں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے اور جس کو امام ترمذی نے ''حسن صحیح'' کہا ہے' نہ صرف یہ کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کے رو سے اس کا صحیح ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نو نشانیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت ملی تھیں۔ جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس وقت تک نہ توریت نازل ہوئی تھی اور نہ اس کے احکام عشرہ تھے۔ ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ نمل میں ہے:

فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ (۲۷/۱۲)

نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف۔

پھر سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان نشانیوں کو گنا دیا ہے۔ یعنی (۱) عصا (۲) ید بیضا (۳) قحط (۴) نقص (۵) ثمر (۶) طوفان (۷) ٹڈی (۸) جوں (۹) مینڈک اور (۱۰) خون۔

اس کے مدتوں بعد حضرت موسیٰؑ اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے ہیں۔ فرعون مع اپنے لشکر کے ان کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں غرق ہوتا ہے اور حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لیے ہوئے کوہ طور کی طرف آتے ہیں۔ وہاں اللہ ان کو میقات پر بلاتا ہے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے توریت عطا کرتا ہے۔

یٰمُوْسٰۤی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ. (۷/۱۴۳)

اے موسیٰ! میں نے تجھ کو اپنے پیغامات اور اپنی ہمکلامی کے لیے لوگوں پر چن لیا' سو جو کچھ میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر کر اور ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی۔

علاوہ بریں اس روایت میں سود نہ کھاؤ' جادو نہ کرو' میدان جہاد سے نہ بھاگو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے احکام عشرہ میں سے گنائے گئے ہیں۔ حالانکہ ان تینوں میں سے ایک بھی ان میں سے نہیں ہے۔ احکام عشرہ یہ ہیں:

میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو۔ تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے (جھوٹی قسم نہ کھا) سبت کے دن کو یاد رکھ' اپنے باپ اور ماں کو عزت دے۔ خون نہ کر۔ زنا نہ کر۔ چوری نہ کر اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ۔ اپنے ہمسایہ پر جھوٹی گواہی نہ دے۔ اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر۔ (توریت سفر استثنا ۵۔ ۶)

(۴) بدقسمتی سے مسلمانوں میں عہد صحابہ ہی میں ابوبکر و علی کے جھگڑے پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اشخاص کے مناقب قرآنی آیات سے بھی نکالنے کی کوشش ہونے لگی تھی۔ چنانچہ بہت سی آیتوں کی تفسیریں ایسی روایتوں کے ذریعہ ملے کی گئی ہیں جن سے معتقد علیہ شخصیتوں کے فضائل ثابت ہوں۔

سورۂ حج میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِى رَبِّهِمْ. (۲۲/۱۸)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار اور بہت سے آدمی اور بہتوں پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں' اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ دو فریق ہیں جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا ہے۔

آیت میں "ھذان" کا مشارالیہ موجود ہے کہ بنی نوع انسان میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے نہیں کرتے۔ یہ دو فریق ہیں کہ ان میں باہمی نزاع رب کے بارے میں ہے مگر روایت یہ کہتی ہے کہ:

یہ آیت جنگ بدر میں حضرت علیؓ اور حمزہ اور عبیدہ کے متعلق نازل ہوئی' جو شیبہ اور عتبہ اور

ولید کے مقابلے کے لیے گئے تھے۔

مشکل یہ ہے کہ سورۂ حج مکی ہے اور جنگ بدر مدینہ میں ہوئی۔ اس لیے یہ شان نزول کیسے ہوسکتا ہے' لیکن چونکہ یہ روایت بخاری میں ہے اس وجہ سے علامہ جلال الدین سیوطی کو "ھذان" سے تین اور جامع البیان کو چھے آیتوں کو مدنی قرار دینا پڑا۔ متاخرین نے تو پورے سورہ کو مدنی کہہ دیا۔ چنانچہ وہ مصاحف میں مدنی ہی لکھا جاتا ہے۔

اذن قتال سے جو اس سورہ میں مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ یہ خیال ہوسکتا تھا کہ یہ مدنی ہے کیونکہ اجازت مدینہ ہی میں مل سکتی تھی' مگر جامع ترمذی میں روایت ہے کہ یہ اجازت مکہ سے نکلتے وقت ملی۔ اس لیے اس بنیاد پر بھی اس سورہ کو مدنی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ بالفرض اگر یہ آیات مدنی بھی ہوں تو قرآن سے عدول کرنا جس میں "ھذان" کا مشارٌ الیہ مذکور ہے۔ کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟

(۵) "كَمَا بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ" کے تحت میں صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن میری امت کے کچھ لوگ لائے جائیں گے' جن کو فرشتے بائیں جانب لے جائیں گے (یعنی جہنم میں) میں کہوں گا کہ اے میرے رب! یہ تو میرے اصحاب ہیں' جواب ملے گا کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے بعد انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ تب میں وہی کہوں گا جو نیک بندے (عیسیٰؑ) نے کہا تھا کہ میں جب تک ان میں رہا ان کا نگراں تھا' جواب ملے گا کہ جب سے تم نے ان کو چھوڑا یہ برابر مرتد رہے۔

یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی کیونکہ:

(۱) اس تفسیر کا آیت سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے صحابہؓ کے متعلق اس قسم کی غیر ضروری پیشین گوئی کریں۔

(۳) عہد صدیقی میں بدوی عربوں میں جو ردت منع زکوٰۃ کی پھیلی تھی' وہ اس سے مراد نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ ایک فوری ہنگامہ تھا جس کو صحابہ کرامؓ نے چند مہینوں میں دبا دیا۔ اس کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ "مازالوا مرتدین علی اعقابھم منذفارقتھم" جب سے تم نے ان کو چھوڑا ہے یہ برابر آخر دم تک مرتد رہے۔

اصلیت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ نہ بنانے کی وجہ سے ان کے طرف دار صحابہ کرام کے مخالف

ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کے یہاں یہ روایت موجود ہے کہ ''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو بجز پانچ کے جملہ صحابہ مرتد ہو گئے۔'' اور ان کا اعتقاد ہے کہ وہ ہمیشہ مرتد رہے۔ بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں ان کے ارتداد کی پیشین گوئی فرمادی تھی، جس سے دشمنانِ صحابہؓ کی مزید تائید ہو رہی ہے۔ اس لیے ہم اس روایت کو جس کی وجہ سے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کو مرتد اور جہنمی قرار دینا پڑتا ہے صحیح نہیں مان سکتے۔

(۶) قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ. قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ. (۲۱/۶۳)

بت پرستوں نے پوچھا کہ اے ابراہیمؑ! کیا تو نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ (ابراہیم نے) کہا بلکہ اس بڑے (بت) نے کیا ہے۔ ان (ٹوٹے ہوئے بتوں) سے پوچھو اگر بول سکتے ہوں۔

اس کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے امام ترمذیؒ نے روایت کی ہے:

کہ ابراہیمؑ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا مگر تین بار۔ انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ بیمار نہ تھے۔ اور (اپنی بیوی) سارہؓ کو بہن بتایا۔ پھر بتوں کو خود توڑا اور جب بت پرستوں نے پوچھا تو کہا کہ اس بڑے بت نے توڑا ہے۔

یہ روایت قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے:

اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا. (۱۹/۴۲)

حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت سچے نبی تھے۔

اللہ جس کو تحقیق کے ساتھ سچا قرار دے یہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جو اسی کی اولاد اور اسی کی ملت کے پیرو تھے اس کو کاذب کہیں؟ یہ تین کذب حضرت ابراہیمؑ کے جو بیان کیے گئے ہیں اُن میں سے حضرت سارہ علیہ السلام کو بہن بنانے کا واقعہ قرآن میں نہیں ہے اور جس طرح پر یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے اس سے صاف طور پر اس کا مجہول ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ دوسرا جھوٹ کہ انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں تو کیا بیماری کوئی ایسی چیز ہے جو انسان میں نادر و نایاب ہے؟ ہزارہا قسم کی چھوٹی بڑی بیماریاں ہیں جن سے کمتر کوئی انسان خالی ہوتا ہے۔ اگر اس وقت جب کہ مشرک ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے انہوں نے اپنی بیماری کا عذر کیا تو اس کو کذب قرار دینے کی کیا دلیل ہے؟ تیسرا جھوٹ

کہ انہوں نے بتوں کو خود توڑا اور الزام لگایا بڑے بت پر' تو یہ طریق معرض بحث میں مخالفوں کو ساکت کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ جس سے بہتر احقاق حق کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ اس کو مشروط کر کے اس طرح فرمایا کہ یہ بڑے بت کا فعل ہے۔ اگر یہ بت بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔ جس کو سن کر مشرکوں نے کچھ دل میں سمجھا اور سر جھکا لیا اور کہا کہ تمہیں تو یہ معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں' اس لیے اس قول کو دنیا میں کوئی صاحب عقل جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ امام رازی نے اس کو اپنی تفسیر میں اصول مناظرہ کے لحاظ سے معارضہ قرار دیا ہے اور پانچ وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ بجائے ایک صدیق نبی کے اس روایت کے راویوں کو جھوٹا کہنا زیادہ آسان ہے۔

(۷) یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا. (۶۸/۳۳)

اے مومنو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰؑ کو اذیت دی' سو اللہ نے اس کو ان کی تہمت سے بری کیا۔

اس کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

حضرت موسیٰؑ بڑے حیادار تھے اس طرح جسم کو چھپائے رکھتے تھے کہ کوئی حصہ اس کا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بنی اسرائیل کے لوگوں نے ان کو ستانا شروع کیا اور کہا کہ یہ اس قدر جو اپنے بدن کو چھپائے رکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو برص یا اور اسی قسم کی کوئی بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا کہ موسیٰؑ کو ان کی تہمت سے بری کرے۔ سو موسیٰؑ ایک دن تنہائی میں اپنے کپڑوں کو ایک پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے اور کپڑے لینے کو اس کی طرف بڑھے تو پتھر ان کے کپڑوں سمیت بھاگا۔ موسیٰؑ لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑے یہ کہتے ہوئے کہ اے پتھر! میرے کپڑے' اے پتھر! میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں پہنچ گئے' انہوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ ساخت میں سب سے بڑھ کر حسین تھے اس طرح اللہ نے ان کے الزام سے موسیٰؑ کو بری کر دیا۔ اس جگہ پر پہنچ کر پتھر رک گیا۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لے کر پہنے۔ پھر پتھر کو لٹھ سے مارنے لگے۔ اللہ کی قسم اس میں ان کی لاٹھی کے نشانات ہیں' تین' چار یا پانچ۔

اس روایت میں غور کرنے کے قابل یہ امر ہے کہ راوی قسم کھا کر بیان کرتا ہے کہ پتھر میں ان کی ضرب کے نشانات ہیں' اس حزم و یقین کے ساتھ کہ گویا اس نے خود مارتے دیکھا ہے۔ اور یہ اسکے سچے ہونے کی نشانی نہیں ہے۔ علاوہ بریں پتھر بے جان' بے ارادہ اور غیر متحرک شے ہے۔ اس کا کپڑوں کو لے بھاگنا ایک معجزانہ امر ہوگا' جو منجانب اللہ ہی ہوسکتا ہے اور یہ چیز حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم رسول پر مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر اس کو لٹھ مارنے کے کیا معنی؟ غرض امارات کذب اس روایت میں واضح ہیں۔

(۸) "وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ" کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ پھر اپنا ہاتھ سلمان (فارسی) کے اوپر رکھا اور فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریا پر بھی معلق ہو تو اس کی قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو اس کو پالیں گے۔

پھر آیت ذیل کی تفسیر میں ہے:

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ۔ (۴۷/۳۸)

اور اگر تم پیٹھ موڑ دو گے تو تمہارے سوا کسی اور قوم کو اللہ تمہارے عوض میں بدل دے گا۔

یعنی اے اہل عرب! اگر تم اللہ کے ان فرائض کی تبلیغ وغیرہ میں جو اس نے تمہارے ذمے عائد کیے ہیں اور جن کی ادائیگی کی وجہ سے تم کو "خیر امت" کا لقب دیا ہے' کوتاہی کرو گے تو وہ تم کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو امام الاقوام بنا دے گا۔ جو ان فرائض کو اچھی طرح ادا کر دے گی۔

امام ترمذی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت لکھتے ہیں کہ:

لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا۔ آپؐ نے سلمانؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا "اس کی قوم کو' اس کی قوم کو"۔

ان روایات سے اہل فارس کے ایمان کی پختگی' ان کی دماغی برتری اور ذہنی فوقیت کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مہیا کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ وہی خلافت عباسیہ میں جملہ مناصب حکومت پر قابض تھے اور رواۃ حدیث بھی زیادہ تر عجم ہی تھے۔

(۹) جب یہ آیت نازل ہوئی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۵۶/۳۳) اے مومنو! نبی پر درود بھیجو اور سلام۔ تو حضرت بشیر بن سعد نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم کس طرح آپؐ کے اوپر درود بھیجا کریں؟ آپؐ نے دیر تک سکوت

کیا۔ پھر فرمایا کہ کہو "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ (الی اٰخرہٖ) یہ وہی درود ہے جس کو مسلمان نمازوں میں پڑھا کرتے ہیں۔

ہر چند کہ یہ روایت صحیح بخاری اور جامع ترمذی دونوں میں ہے لیکن بوجوہ ذیل قرآن اور اسلام دونوں کے سراسر منافی ہے۔ اور کبھی قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہو سکتی۔

(۱) قرآن میں صرف نبی پر درود بھیجنے کا حکم ہے نہ کہ ان کی آل پر۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا. (۳۳/۴۳)

وہی ہے جو تمہارے اوپر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی میں نکالے اور وہ ایمان والوں پر مہربان ہے۔

جب اللہ اور اس کے فرشتے تمام مومنوں پر درود بھیجتے ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کا نبی جو رحمۃ للعلمین ہے صرف اپنی ہی آل پر درود بھیجے اور امت کو اسی کی تعلیم دے جائے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود حکم دیا گیا ہے کہ وہ صدقہ دینے والے مومنوں پر درود بھیجیں۔ اس میں کسی خاندان کی تخصیص نہیں ہے۔

وَصَلِّ عَلَیْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ. (۹/۰۳)

تو ان کے اوپر درود بھیج کیونکہ تیرا درود ان کے لیے سکون (قلب) ہے۔

(۴) اس درود میں "آل محمدؐ" میں کوئی استثناء نہیں ہے حالانکہ ان میں بیشتر ایسے لوگ ہیں جو اپنے اماموں کو معصوم سمجھتے ہیں اور صحابہ کرام پر جن کے اوصاف قرآن میں اور جن کے اسلامی کارنامے دنیا میں روشن ہیں تبرا بھیجتے ہیں۔ یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایسے تبرائیوں پر ہم درود بھیجیں۔

(۵) یہ درود سراسر خاندان پرستی ہے جس سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے۔ اللہ نے مقبولیت کی بنیاد نسل اور خون پر نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر رکھی ہے۔ جس کے لیے کوئی کنبہ یا قبیلہ مخصوص نہیں۔ یہود جو اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ان کا گھمنڈ توڑنے کے لیے صاف

کہہ دیا کہ تم نہ اس کے بیٹے ہو نہ محبوب' بلکہ اس کے پیدا کیے ہوئے جیسے اور انسان ہیں ویسے ہی تم بھی ہو۔

قرآن کے حکم کی تعمیل صرف نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنے سے ہو جاتی ہے اس میں آل محمد کا اضافہ یقیناً اس وقت ہوا ہے جب کہ بنی امیہ کے تغلب سے بنی ہاشم سلطنت سے محروم ہو کر دین کی راہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اپنی عظمت قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بعض سادہ دل مسلمانوں نے آل کے معنی کو وسعت دے کر تمام امت پر پھیلانے کی کوشش کی ہے اور قرآن کریم کے لفظ ''آل فرعون'' نیز ایک حدیث سے جس کو وہ روایت کرتے ہیں کہ ''من اتبعنی فھو الی'' (جو بھی میری پیروی کرے وہ میری آل ہے) سند لائے ہیں' لیکن امام شافعیؒ نے حرملہ کی روایت سے آل کے معنی کو صرف بنی ہاشم و بنی مطلب پر محدود کر دیا ہے۔ نیز دوسری حدیث لاتحل صدقة لمحمد ولا لال محمد (کوئی صدقہ نہ محمد کے لیے حلال ہے نہ آل محمد کے لیے) سے دیگر فقہا نے بھی اسی کی تائید کی ہے کیونکہ ان کے نزدیک صدقہ جن لوگوں پر حرام کیا گیا ہے وہ اولاد ہاشم اور مطلب ہی ہیں۔

ازواج مطہرہ کو بھی اس میں داخلہ نہ ملتا۔ مگر حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث مل گئی جس کی بدولت وہ ان میں شامل سمجھی گئیں۔ یعنی کُنَّا ال محمد نمکث شهرا لا نستو قد نارا. ہم آل محمدؐ پر مہینے کا مہینا گزر جاتا تھا کہ آگ جلانے کی نوبت نہیں آتی تھی (بوجہ فقر کے)

الغرض آل محمدؐ کا مفہوم اس درود میں جمہور اہل اسلام کے خیال میں بنی ہاشم و بنی مطلب پر محدود ہے اسی لیے آلہ کہنے کے بعد وہ اصحابہ و ازواجہ وغیرہ کے الفاظ بڑھاتے ہیں اگر آل سب کو شامل ہوتا تو اس کی ضرورت کیا تھی۔

(۱۰) قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (۴۲/۲۲)

کہہ دے کہ اس (تبلیغ) پر میں کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا بجز رشتہ کے سلوک کے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر کی ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت جملہ بطون قریش میں تھی۔ اللہ نے آپؐ کی زبان سے اعلان کرایا کہ کہہ دو کہ میں تبلیغ قرآن اور تعلیم دین پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو۔

امام ترمذی نے اس کو درج کرنے کے باوجود سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ "قربی" کے معنی اس آیت میں 'ال محمدؐ' کے ہیں' یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو۔

یہ بھی دراصل وہی پروپیگنڈا ہے اور قرآن کی سراسر تحریف۔ کیونکہ قرآن میں "اِلَّا الْمَوَدَّةَ لَا قُرْبَانِی" نہیں ہے بلکہ "اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی" اور قربیٰ کے معنی رشتہ کے ہیں' رشتہ داروں کے نہیں ہیں۔ عترت کی محبت لازمی گروانے سے ان کو خلافت دینا بھی امت کا فریضہ ہو جاتا ہے۔ اور یہی ان کا مقصود تھا۔

جامع البیان میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ (یعنی عباس اور ان کی اولاد) کو اللہ و رسولؐ کے لیے محبوب نہ رکھے۔

امام ترمذی نے ابواب التفسیر میں تو نہیں مگر کتاب المناقب میں اس کو درج کیا ہے۔ یہ روایت عباسی خلفاء کی محبت کو لازم گردانتی ہے جو بغداد میں حکم راں تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس مہبط وحی سے جو توحید کا منارہ دنیا میں بلند کرنے کے لیے آیا تھا۔ ایسا شرکیہ قول ممکن ہے کہ جب تک کسی کے دل میں اپنے ہی جیسے دوسرے بے بس انسان کی محبت نہ ہو اس وقت تک ایمان کا داخلہ ہی اس میں نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ امت اسلامیہ کے بہترین افراد حضرات عشرہ مبشرہ و اصحاب بدر کے دلوں میں کیسے ایمان داخل ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت تک تو حضرت عباس جن کی محبت شرط ایمان کہی گئی ہے خود ہی ایمان نہیں لائے تھے۔

(۱۱) ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل کہتے تھے کہ جب فرعون غرق ہونے لگا اور ایمان لانا چاہتا تھا۔ کاش اس وقت اے محمدؐ! تم مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کی مٹی لیے ہوئے اس کے منہ میں ٹھونس رہا تھا اس خوف سے کہ کہیں یہ کلمہ نہ پڑھ دے اور اس پر اللہ کی رحمت نہ آ جائے۔

یہ روایت قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ

(۱) جبریل ہر جگہ اللہ کی طرح موجود نہیں رہتے۔ قرآن میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ فرشتے بلا حکم الٰہی نہیں اترتے۔ (وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّکَ)

(۲) حضرت جبریلؑ روح القدس ہیں، جن کا وظیفہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کے پاس اللہ کے پیغامات پہنچائیں نہ کہ کلمہ حق سے روکنے کے لیے کسی کے منہ میں مٹی ٹھونسیں۔

(۳) فرشتے اپنے ارادہ یا جذبہ سے کوئی کام نہیں کرتے بلکہ "یَفْعَلُوْنَ مَایُؤْمَرُوْنَ" وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ اگر جبریلؑ کا یہ فعل بحکم الٰہی تھا تو پھر فرعون ان کے اوپر غالب کیوں رہا کیونکہ قرآن میں تو صریح ہے کہ اس نے کلمہ پڑھ دیا:

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ.

(۱۰/۹۰)

فرعون نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں بجز اس معبود کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمان ہوں۔

اور جبریلؑ کی ساری محنت اکارت گئی۔

(۱۲) وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ نَحْنُ الْوَارِثُوْنَ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْکُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ وَ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ یَحْشُرُهُمْ. (۱۵/۲۵)

اور ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں اور ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔ یہ تیرا رب ہی ہے جو ان کو حشر میں لائے گا۔

اس آیت کے سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں اگلوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے گزر گئے اور پچھلوں سے وہ لوگ جو ان کے بعد مرے یا مریں گے۔ یہ سب کے سب اللہ کے علم میں ہے جو ان کو قیامت کے دن میدان حشر میں جمع کرے گا۔ اسی مفہوم کی دوسری آیت میں ہے

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ. لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ. (۵۶/۵۰)

کہہ دے کہ اگلے اور پچھلے ضرور معینہ دن کی میعاد پر جمع کیے جائیں گے۔

لیکن جامع ترمذی میں روایت ہے حضرت ابن عباسؓ سے کہ:

ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہؐ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صفت میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں۔ مگر کچھ لوگ

پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے اس کی طرف جھانکتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔

متقدمین اور متاخرین کی ایسی تشریح اور صحابہ کرام پر ایسا الزام نہ صرف قرآن بلکہ عقل کے بھی منافی ہے۔

(۱۳) دو ایک مثالیں تفسیر بالروایت کی ایسی لکھتا ہوں، جن کی خود دوسری حدیث مخالفت کرتی ہے۔

اسراء کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ہم بیت المقدس میں آئے تو جبریل نے اپنی انگلی سے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں سوراخ ہو گیا۔ براق کو اسی میں (غالباً رسی ڈال کر) باندھ دیا۔

اس کے دو ہی صفحہ کے بعد پھر امام ترمذی حضرت حذیفہ بن الیمان سے یہ روایت لکھتے ہیں کہ:

لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو باندھ دیا تھا۔ کیوں؟ کیا اس لیے کہ بھاگ نہ جائے، حالانکہ اس کو تو اللہ نے ان کے لیے مسخر کر دیا تھا (یعنی نہ وہ بھاگ سکتا تھا نہ اس کو باندھنے کی ضرورت تھی)

یہ دونوں حدیثیں امام ترمذی کے بیان کے مطابق ''صحیح'' ہیں۔

(۱۴) جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک طویل روایت بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین سے آسمان تک پانسو سال کی راہ ہے۔ پھر ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک بھی اسی قدر فاصلہ ہے اور آسمان سات ہیں جن کے اوپر عرش ہے۔ اس کا فاصلہ بھی ساتویں آسمان سے پانسو سال کی راہ ہے۔ اسی طرح زمین کے نیچے زمین ہے پانسو سال کی راہ کی مسافت پر اور زمینیں بھی سات ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ قسم ہے اللہ کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان

ہے کہ اگر تم میں سے کوئی رسی زمین کے اسفل ترین طبقہ میں لٹکائے تو وہ ٹھیک اللہ کے اوپر جا کر گرے گی۔ پھر آپؐ نے پڑھا ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (الآیہ)

ھُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ کی یہ تفسیر کہ اللہ ادھر سب سے اوپر عرش پر ہے اور ادھر سب سے نیچے تحت الثریٰ میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہو سکتی۔ رواۃ کو تو نہیں لیکن اس حدیث کے شارحین کو یہ احساس ہوا کہ اس سے اللہ کا تعدد لازم آتا ہے چنانچہ خود امام ترمذی نے ان کی یہ توجیہ نقل کی ہے کہ وہ رسی جو لٹکائی جائے گی اللہ کی ذات پر نہیں بلکہ اللہ کے علم پر گرے گی، کیونکہ اللہ کی ذات تو ایک ہی ہے اور وہ قرآن کی تصریحات کے مطابق عرش پر ہے۔

مگر پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا جب رسی لٹکائی جائے گی اور طبقہ در طبقہ زمینوں میں لٹکتی ہوئی گرے گی، تو اللہ کا علم اس کو محیط نہ ہوگا؟ پھر تحت الثریٰ میں پہنچ کر علم الٰہی پر گرنے کے کیا معنی؟

اب اس کے برخلاف ایک دوسری حدیث سنئے کہ وہ بھی ترمذی میں ہے حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۷۱ یا ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی ابھی اتنی ہی ہے کہ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

غالباً یہ "کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ" کی تفسیر ہے اور چونکہ قرآن میں قیامت کے ذکر میں ہے کہ اس دن حاملین عرش آٹھ ہوں گے، اس وجہ سے بکرے ابھی سات ہی ہیں۔ یہ بکرے کس پہاڑ کے ہیں؟ ہم نے شروح حدیث میں اس کا نام بہت ڈھونڈا مگر نہ پایا۔

یہاں افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ یہ رواۃ حدیث بجز روایت کشی کے اور کوئی علم کمتر جانتے تھے۔ امام ترمذی نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی، جس سے تقریباً ایک صدی پہلے سے مسلمانوں میں ہیئت اور جغرافیہ کے فن رائج ہو چکے تھے۔ اگر انہوں نے ان کا مطالعہ کیا ہوتا تو ایسی روایتوں کو صحیح قرار دے کر درج کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

یہ ہے ''مشتے نمونہ از خروارے'' ان روایات کا جو تفسیر قرآن کے متعلق صحاح ستہ میں وارد ہوئی ہیں' جن پر اہل سنت اگر ایمان نہیں تو اذعان ضرور رکھتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تفسیری بلکہ ان کی دیگر روایات کے پایہ اعتبار کا بھی اہل نظر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ دین ایک حقیقت ثابتہ ہے اور اس کو افسانہ بنا لینا روحانی موت۔ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اہل تقویٰ اور ارباب بصیرت انسانی باطل آرائیوں سے منہ موڑ کر قرآن حکیم کی طرف رخ کریں جو سرتاسر زندگی ہے اور خالص حق' نور مبین ہے اور انسانی تشریحات سے بے نیاز اور ہر زمانہ میں ایک نیا عالم پیدا کر سکتا ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار  بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

# علم حدیث

حدیثیں یعنی وہ اقوال واعمال وغیرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اور بسلسلہ روایت کتابوں میں مدون کیے گئے ہیں ان کے متعلق ابتدا ہی میں بحث شروع ہوئی کہ ان کی حیثیت دینی نہیں ہے بلکہ تاریخی ہے جس کی بنا اس پر تھی کہ ان کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف غیر یقینی ہے۔ کیونکہ خبروں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صبح سے شام تک میں تبدیل ہو کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہیں اور جتنے بڑے آدمی کی باتیں بیان کی جاتی ہیں' اتنا ہی ان میں تبدل وتغیر کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں سب سے بڑے آدمی تھے۔ چنانچہ پہلی ہی صدی ہجری سے امت میں ایسے طبقات پیدا ہو گئے۔ جو اپنے اغراض کے لیے حدیثیں بنا بنا کر حضورؐ کی طرف منسوب کرنے لگے۔ وضاعین وکذابین کے تراجم اور موضوع روایات جن کے بیسیوں مجموعے موجود ہیں۔ اس پر شاہد ہیں اور آج حدیث کی جس قدر کتابیں امت کے ہاتھوں میں ہیں ان میں سے کوئی عہد رسالت یا زمانہ صحابہ کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک موطا امام مالک کے سوا جو دوسری صدی ہجری کی تالیف ہے' بقیہ جملہ کتب حدیث جن میں صحاح ستہ بھی شامل ہیں' تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کی مرتب کی ہوئی ہیں۔

محدثین نے روایات کو دینی تسلیم کر لیا اور ان کے اثر سے تمام امت میں ان کی دینی حیثیت مسلم ہو گئی' مگر محققین کی ایک جماعت ہمیشہ سے قرآن ہی کو مکمل دین مانتی اور حدیثوں کو تاریخ دینی سمجھتی رہی ہے' اس لیے میں نے چاہا کہ تاریخ حدیث کے ان ابواب کو روشنی میں لاؤں جن سے اس کی حقیقت واضح ہوتی ہے تاکہ اس کا صحیح رتبہ معلوم ہو سکے۔

## روایت حدیث:

روایت کا آغاز رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام جن اوقات میں صحبت مبارک میں موجود نہیں رہتے تھے ان اوقات کے احوال واقوال نبوی کو دوسرے صحابہ سے جو حاضر رہتے تھے پوچھتے اور سنتے تھے۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ میں اور میرے ایک انصاری پڑوسی[1] باری باری سے ایک ایک دن رسالت مآب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے پھر ہم ایک دوسرے کو اپنے اپنے دن کے وہ حالات جو وہاں گزرتے تھے سنا دیتے تھے۔[2] لیکن یہ حضرات کرام سنتے اسی سے تھے جس پر ان کو خود اعتماد ہوتا تھا کیونکہ اس عہد میں منافقین بھی تھے جو طرح طرح کی غلط باتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کیا کرتے تھے اور وہ مسلمانوں میں ایسے ملے جلے رہتے تھے کہ ان کا امتیاز کرنا مشکل تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

وَمِن اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ. (۹/۱۰۱)

مدینہ والوں میں سے کچھ لوگ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں تم ان کو جانتے نہیں ہو ہم ان کو جانتے ہیں۔

علاوہ بریں رسول اللہ ﷺ کی تاکید تھی کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے سے بچو۔[3] اس لیے عہد رسالت میں روایتیں بہت تھوڑی تھیں اور وہ بھی اخباری حیثیت رکھتی تھیں۔ دین کی بنا قرآن کریم اور آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ پر تھی۔ جیسا آپ کو کرتے دیکھتے یا حکم پاتے اس کے مطابق عمل کرتے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ چونکہ اپنی محبوب ترین شخصیت سے محروم ہو گئے تھے اس لیے فرصت کے اوقات میں دو چار جب مل کر بیٹھتے تو آپؐ کے زمانہ کے تذکرے درمیان لا کر آپ کی یاد تازہ کرتے مگر ان بیانات میں اختلافات ہونے لگے اس وجہ سے خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے روایت کی یک قلم ممانعت کر دی اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا:

''تم جب آج اختلاف کرتے ہو تو آئندہ نسلیں اور بھی اختلافات کریں گی۔ لہذا رسول

---

[1] ان کی سکونت مسجد نبوی سے فاصلہ پر محلہ بنی امیہ بن زید میں تھی۔

[2] صحیح بخاری [3] ابن ماجہ ص ۵

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے۔ جو اس نے جائز کیا ہے اس کو جائز اور جو اس نے ناجائز کیا ہے اس کو ناجائز سمجھو۔''[1]

مگر باوجود اس ممانعت کے بھی روایت کا سلسلہ جاری رہا کیونکہ اس کو جرم قرار نہیں دیا تھا۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ بھی اپنے زمانہ میں روایت کو روکتے رہے۔ قرظہ بن کعب کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت کے ساتھ عراق کو روانہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ مقام صرار تک ہم کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ آئے وہاں پہنچ کر فرمایا: ''تم جانتے ہو کہ میں کیوں یہاں آیا ہوں؟'' ہم نے کہا کہ ہماری مشایعت اور تکریم کی غرض سے فرمایا کہ ہاں! اور اس لیے بھی کہ تم سے کہوں کہ تم وہاں جا رہے ہو جہاں لوگوں کی تلاوت قرآن کی آواز شہد کی مکھیوں کی آواز کی طرح گونجتی رہتی ہے لہذا ان کو حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا اور روایتیں نہ سنانا۔'' قرظہ کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے پھر کبھی میں نے حدیث نہیں بیان کی۔[2]

فاروق اعظمؓ روایت کے معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ ابی بن کعب کو جب حدیثیں سناتے دیکھا تو درہ لے کر ان کو مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔[3] ایک بار ابوسلمہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے جو کثرت روایت میں مشہور ہیں، پوچھا کہ کیا تم اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر ان کے زمانہ میں بیان کرتا تو مجھے پیٹ ڈالتے۔[4]

حضرت عمر فاروقؓ اس امر میں صحابہ کبار کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا گیا کہ عبداللہ بن مسعودؓ ابوالدرداءؓ اور ابوذر رضی اللہ عنہ کو ڈانٹا کہ تم یہ کیا روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے رہتے ہو؟ پھر ان کو مدینہ میں نظر بند رکھا اور جب تک زندہ رہے کہیں جانے کی اجازت نہیں دی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ذہبی

[2] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۷۵

[3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۷

[4] توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری ص ۱۱ تا ۱۷

خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کو روایت کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اور وہ اس کو مسترد کر دیا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت علیؓ کے بیٹے محمد اپنے والد سے ایک پرچہ لے کر جس میں نبی اکرم ﷺ کا حکم زکوٰۃ کے متعلق لکھا ہوا تھا۔ ان کے پاس گئے آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے معاف رکھو۔ [1]

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کثرت روایت سے منع فرماتے۔ خود ان کے سامنے جب کوئی حدیث بیان کرتا تو اس سے حلف لیتے۔ [2] اکثر تاکید کیا کرتے کہ جن حدیثوں کو لوگ نہیں جانتے ان کو نہ بیان کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ اللہ و رسولؐ کی تکذیب کرنے لگیں؟ [3]

خلفاء راشدین ہی کی طرح بالعموم صحابہ کرام بھی روایت کے معاملہ میں سخت محتاط تھے بلکہ بعض حضرات اس سے بالکلیہ اجتناب کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت زبیر سے ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے کہا کہ جس طرح دوسرے اصحاب حدیثیں بیان کرتے ہیں' میں نے آپ کو بیان کرتے نہیں سنا۔ فرمایا کہ میں نے کبھی آنحضرتؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا' مگر میں نے آپ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مقعده من النار'' جو میرے اوپر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ پھر حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں نے اس میں ''متعمدا'' یعنی قصداً کا لفظ بڑھالیا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے یہ لفظ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نہیں سنا۔ [4]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ توسیع روایت کے لیے لوگوں نے کرلیا ہے' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا خواہ قصداً ہو یا بلا قصد جہنم مول لینا ہے۔ حضرت انسؓ سے بھی مروی ہے کہ آنحضرتؐ کا یہی فرمان مجھ کو بیان کرنے سے روکتا ہے۔ [5]

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ نے حضرت زید بن ارقم سے درخواست کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنایئے۔ فرمایا کہ ہم بوڑھے ہو گئے اور بھول گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے کا معاملہ بھی بہت سخت ہے۔ سائب بن یزید کا بیان ہے کہ میں حضرت سعد بن مالکؓ کے ساتھ مدینہ تک گیا' مگر ان کو کوئی حدیث بیان کرتے نہیں سنا۔ اسی طرح امام شعبی کا قول ہے کہ میں حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں ایک سال تک رہا اور کوئی حدیث ان کی زبان سے نہیں سنی۔ [6] یہی نہیں کہ صحابہ خود حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے بلکہ دوسروں سے جو حدیثیں سنتے

---

۱ تا ۶ توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری ص ۱۱ تا ۱۸

تھے' ان کو قبول کرنے میں بھی تامل فرماتے تھے چنانچہ اکثر صحابہ سے بہت سی روایتوں کے قبول کرنے میں توقف کرنا ثابت ہے جس سے ان لوگوں نے سند پکڑی ہے جو حدیثوں کو دینی حجت نہیں مانتے۔ [1]

حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کہ آگ کی چھوئی ہوئی چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے' تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ اس بنیاد پر تو آگ پر گرم کیے ہوئے پانی سے وضو ہی نہیں ہو سکتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کھیتی کے کتے کے متعلق سنی تو فرمایا کہ ہاں ابو ہریرہ کے پاس کھیتی ہے۔ [2]

حضرت محمود انصاری نے جو صحابی تھے' جب یہ حدیث بیان کی کہ جس نے "لا الہ الا اللہ" کہہ دیا' وہ جہنم کے اوپر حرام ہو گیا تو حضرت ابوایوب انصاری نے فرمایا کہ واللہ! میں نہیں سمجھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی ایسا کہا ہو۔ [3]

بعض روایات کو صحابہ نے قرآن کے خلاف دیکھ کر ان کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مثلاً فاطمہ بنت قیس کی روایت کہ طلاق بائنہ پائی ہوئی عورت کے لیے شوہر کے ذمہ نہ مکان ہے نہ نفقہ' حضرت عمرؓ نے قبول نہیں کیا اور کہا کہ قرآن کے خلاف ایک عورت کی کیسے مان لوں' جس نے معلوم نہیں صحیح یاد بھی رکھا ہے یا نہیں؟

حضرت ابن عمر نے قلیب بدر والی روایت جب بیان کی کہ مردے سنتے ہیں تو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ ابن عمر پر رحم کرے۔ قرآن میں تو ہے "انک لا تسمع الموتی وما انت بمسمع من فی القبور."

اسی طرح جب ام المومنینؓ موصوفہ کے سامنے یہ روایت پیش کی گئی کہ مردہ پر اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے تو کہا یہ روایت صحیح نہیں ہے' کیونکہ قرآن میں ہے کہ ایک کا گناہ دوسرا نہیں اٹھائے گا' لا تزر وازۃ وزر اخری"

اس قسم کی روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ حدیث کو حتمی حجت نہیں سمجھتے تھے اور کبھی قرآن اور کبھی قیاس کے خلاف دیکھ کر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

وجوہات مذکورہ کے باعث عہد صحابہ میں روایات کا ذخیرہ نہایت قلیل تھا۔ علاوہ بریں وہ عملی زندگی

---

[1] [2] توجیہ النظر الی اصول الاثر ص ۱۱ تا ۱۸

[3] صحیح بخاری باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ

میں منہمک تھے اور اعلائے کلمۃ الحق وحروف وفتوحات کی مشغولیت سے ان کے لیے یہ موقع بھی کم تھا کہ بیٹھ کر روایتیں کرتے اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ان کے ناموں سے جو بے شمار روایتیں منسوب کی گئی ہیں وہ زمانہ مابعد کے رواۃ کا کارنامہ ہیں' جب کہ حدیثوں نے فن کی صورت اختیار کر لی۔ اور ہر روایت کے لیے سلسلہ سند کی ضرورت پڑی جو بلا کسی صحابہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی نہیں ہو سکتا تھا۔

جماعت صحابہ میں سب سے زیادہ جس کے نام سے روایتیں بیان کی گئی ہیں وہ حضرت ابوہریرہؓ ہیں۔ ابن مخلد کا بیان ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے۔[1] حالانکہ وہ عام خیبر میں اسلام لائے اور صرف تین سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضوری میں شرف یابی کا موقع پایا۔ پھر یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ ان کی روایتیں اس قدر ہو سکتی ہیں جن میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ ان کے اوپر عقل وعلم کی رو سے گرفت کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے اس لیے ہمارا ضمیر قبول نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی روایتیں انہوں نے بیان کی ہوں گی۔

عہد صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ آتا ہے۔ جس میں خلفائے بنی امیہ کا استبداد امت پر مسلط ہو چکا تھا اور بجائے اس کے کہ خلافت راشدہ میں ہر مسلم خود مختار آزاد اور صرف اکیلے اللہ کا بندہ تھا' اب شخصی حکومت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا اور تمام امت جبراً وقہراً رعایا بنائی گئی تھی' اس لیے ذہنیتوں میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی اور صلاح وتقویٰ کی بھی وہ کیفیت باقی نہیں تھی جو صحابہ کرام کے عہد میں تھی۔ سلطنت اور مذہب میں تفریق ہو جانے کے باعث دینی قیادت علماء کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ اس وجہ سے روایت کا سلسلہ بہ نسبت سابق کے بڑھ گیا تھا۔ پھر بھی ان شاگردان صحابہ میں بہت کچھ صداقت موجود تھی اور وہ روایتوں کے بیان نیز ان کے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں جب حدیث کی تدوین شروع ہوئی' اس نے فن کی صورت اختیار کر لی اور طالبان حدیث ان ائمہ کے پاس جو اس میں شہرت رکھتے تھے' اس کی تحصیل کے لیے جمع ہونے لگے اور یہ سلسلہ بڑھنے لگا۔ عہد عباسیہ میں جو ۱۳۲ھ سے شروع ہوا' حدیثوں کی روایت سیلاب کی طرح بڑھ گئی اور جملہ اسلامی ممالک میں کثرت کے ساتھ اس کا چرچا پھیل گیا' کیونکہ خلفاء وامراء کی دنیاداری اور دین سے بے

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۱

پروائی کی وجہ سے طالبان دین تمام تر علمائے حدیث کے گرد سمٹ گئے' جس سے ان کی عظمت وشان قائم ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ہزاروں دنیاوی جاہ وشہرت کے طالبوں نے بھی حدیث کا پیشہ اختیار کرلیا اور سچی اور جھوٹی ہر قسم کی روایتیں بیان کر کے عوام پر اپنی بزرگی کا سکہ جمانے لگے' یہاں تک کہ حدیثوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ سے اوپر ہے۔ [1] امام یحییٰ بن معین جو حدیث کے امیر المومنین بولے جاتے ہیں' بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے۔ [2] مقدمہ صحیح بخاری میں ہے کہ امام بخاری نے جب اپنی صحیح لکھنی شروع کی تو چھے لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں ۷۲۷۵ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق پایا جن کو درج کیا۔

لیکن خود انہیں ائمہ حدیث میں سے جن کا مشغلہ دن رات روایت تھا ایسے لوگ نکلے' جن کی طبیعتیں اس سے بیزار ہوگئیں اور وہ اس کو تقویٰ کے خلاف سمجھنے لگے۔ حافظ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ کی کتاب مختصر جامع بیان العلم وفضلہ سے اقتباس کر کے چند ائمہ کے اقوال لکھتا ہوں:

ضحاک ابن مزاحم متوفی ۱۰۵ھ نے فرمایا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ قرآن لٹکا دیا جائے گا۔ اس کے اوپر مکڑیاں جالے تنیں گی۔ کوئی کام اس سے نہیں لیا جائے گا اور لوگوں کا عمل حدیث وروایت پر ہوگا۔ سلیمان بن حیان ازدی متوفی ۱۹۶ھ نے بھی جن کی کنیت ابو خالد الاحمر ہے کہا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مصاحف کو بے کار چھوڑ دیں گے اور صرف حدیث وفقہ ان کا مشغلہ ہوگا۔

امام داؤد طائی نے روایت ترک کر دی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ کب تک آپ حدیث کی تعلیم چھوڑ کر گھر میں بیٹھے رہیں گے۔ جواب دیا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ ایسے راستے میں ایک قدم بھی رکھوں جو حق کے خلاف ہے۔

فضیل بن عیاض عابد الحرمین متوفی ۱۸۷ھ کے پاس ایک جماعت طالبان حدیث کی پہنچی۔ انہوں نے ان کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی اور گھڑکی سے ان کی طرف سر نکالا۔ لوگوں نے سلام کیا اور کیفیت پوچھی۔ فرمایا میں اللہ کی طرف

---

[1] توجیہ النظر ص ۴

[2] تہذیب الاسماء واللغات جلد ۱ ص ۱۵۷۔

سے تو عافیت میں ہوں مگر تمہاری طرف سے مصیبت میں جس شغل میں تم ہو یہ اسلام میں نئی بدعت پیدا ہوئی ہے "انا لله و انا الیه راجعون"۔ تم نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس کو حاصل کرتے تو تمہارے دلوں کو شفا نصیب ہوتی۔ لوگوں نے کہا کہ اسے تو ہم پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا وہ ایسی کتاب ہے جو تمہاری اور تمہاری اولاد کی مشغولیت کے لیے بھی کافی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی:

**یَاأَیُّهَا النَّاسُ قَدْجَاءَ تْکُمْ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ. قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِکَ فَلْ یَفْرَحُوْا هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ.**

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ چکی۔ کہہ دے کہ اللہ کی مہربانی اور اس کی رحمت پر تم خوشی مناؤ یہ اس سے بہتر ہے جس کو تم جمع کر رہے ہو۔

امام سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اس علم میں کیا خوبی ہے جس میں ساٹھ سال گزارنے کے بعد اب یہی آرزو ہے کہ کاش برابر برابر نکل جاتے۔ نہ عذاب پاتے نہ ثواب ایک بار فرمایا کہ حدیث اگر اچھی چیز ہوتی تو روز بروز بڑھتی نہ جاتی۔

امام شعبہ نے کہا کہ پہلے جب میں کسی محدث کو دیکھتا تھا تو خوش ہوتا تھا۔ مگر اب کوئی شے میرے نزدیک اس سے زیادہ مکروہ نہیں کہ میں ان میں سے کسی کا چہرہ دیکھوں۔ ایک بار انہوں نے راویان حدیث کی ایک جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا "ان **هٰذَاالْحَدِیْثُ یَصُدُّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ** [1]

امام سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ کہا کرتے تھے کہ کاش یہ علم (حدیث) میرے سر پر شیشیوں کا ٹوکرا ہوتا اور گر کر چور چور ہو جاتا تاکہ اس کے خریداروں سے تو نجات مل

---

1 یہ حدیث تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے۔ کیا تم باز آ جاؤ گے؟ اس میں لطف یہ ہے ان هذا الحدیث کو چھوڑ کر بقیہ جملہ قرآن کی آیت ہے۔

جاتی۔ ایک بار فرمایا: کہ جو مجھ سے دشمنی رکھے اللہ اس کو محدث بنا دے۔ ایک دن اصحاب حدیث کی ایک جماعت سے کہا کہ اگر ہم کو اور تم کو حضرت عمرؓ دیکھ پاتے تو درے سے خبر لیتے۔ امام شعبہ کی طرح یہ بھی محدثوں کی صورت سے بیزار تھے۔ طالبان حدیث کے ہجوم سے بھاگ کر اپنے گاؤں میل اخضر میں رہتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ حدیث اگر خیر ہوتی تو روز بروز کم ہوتی' بڑھتی نہ جاتی۔

اس عہد کے مشہور شاعر بکر بن حماد نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

لقد جفت الا قلام بالخلق کلھم فمنھم شقی خائب و سعید

یعنی ساری مخلوقات کی تقدیر لکھ کر قلم خشک ہو چکا۔ اب کوئی ان میں سے بدبخت نامراد ہے کوئی بدنصیب۔

ام اللیالی بالنفوس سریعۃ ویبدئ ربی خلقہ و یعید

زمانہ لوگوں پر تیزی سے گزر رہا ہے اور اللہ مخلوق کو یکے بعد دیگرے پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

اری الخیر فی الدنیا یقل کثیرہ وینقص نقصا و الحدیث یزید

میں دیکھتا ہوں کہ اچھی چیزیں دنیا میں کم ہوتی اور گھٹتی جا رہی ہیں' لیکن حدیث ہے کہ برابر بڑھتی جا رہی ہے۔

فلو کان خیرًا قل کالخیر کلہ واحسب ان الخیر منہ بعید

اگر یہ بھی اچھی چیز ہوتی تو دوسری اچھی چیزوں کی طرح گھٹتی۔ میرا خیال ہے کہ خیر اس سے بعید ہے۔

یہ اقوال ان اہل بصیرت ائمہ حدیث کے ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے کمال اور جامعیت کو دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ حدیث کی حیثیت دینی نہیں ہے مگر عام محدثین کے نفوس وطبائع پر حدیث کا دینی حیثیت سے اس قدر غلبہ ہو چکا تھا کہ ان کا انحراف اس سے مشکل تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان اماموں کے اقوال کے اثر کو مٹانے کے لیے روایت کی فضیلت اور اس کے ثواب کی حدیثیں پھیلائیں۔ نیز ان بزرگوں کی مخالفت بلکہ اہانت کے لیے اس قسم کی روایتیں وضع کیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عن قریب ایسا ہوگا کہ تم میں سے کوئی پیٹ بھرا شخص اپنے پلنگ پر تکیہ لگائے میری حدیثیں سن کر کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان قرآن ہے اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور حرام کیے ہوئے کو حرام

سمجھو۔ یاد رکھو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے مثل اور بھی بلکہ زیادہ۔'' حالانکہ صدیق اکبرؓ نے جیسا کہ ہم نقل کر چکے ہیں۔ روایت سے منع کرتے وقت یہی فرمایا تھا کہ اگر کوئی سوال کرے تو اس سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے جو اس نے جائز کیا ہے اس کو جائز اور جو ناجائز کیا ہے اس کو ناجائز سمجھو۔ نیز فاروق اعظمؓ فرمایا کرتے تھے کہ ''حسبنا کتاب اللہ'' ہمارے واسطے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ ان کے خلاف یہ روایت قرآن کریم کو ناکافی اور غیر مکمل بتاتی ہے جو اس کے جعلی ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

اسی قسم کی باہم متعارض روایات کو دیکھ کر جو ہر باب اور ہر شعبہ میں ہیں' معتزلہ نے محدثین پر سخت حملے کیے کہ تم نے مکذوب روایات سے دین کو فساد کر ڈالا۔ اور علماء میں اختلاف پیدا کیا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی مخالفت بلکہ تکفیر کرنے لگے یہاں تک کہ امت فرقوں میں بٹ گئی۔ امام ابن قتیبہ نے کتاب مختلف الحدیث لکھ کر ان اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی' لیکن اس میں سوائے محدثانہ تاویلات وتوجیہات کے اور کیا ہے؟

الغرض ان ائمہ کے باعث قصر حدیث میں جو زلزلہ آ گیا تھا' اس کا روک دینا محدثین کے لیے کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ آخر کار حدیث کا غلبہ یہاں تک پہنچ گیا کہ قرآن کریم سے بھی اس کی اہمیت بڑھا دی گئی۔ امام اوزاعی نے کہا ہے کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے۔ جس قدر کہ حدیثیں قرآن کی امام یحییٰ بن کثیر کا قول ہے کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے۔ یہ بات جب امام احمد بن حنبل سے کہی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ میں اتنی جسارت تو نہیں کر سکتا' ہاں یہ کہتا ہوں کہ حدیثیں قرآن کی مفسر ہیں۔ [2]

## کتابتِ حدیث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اعلان فرما دیا تھا کہ:

''مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے کچھ لکھ لیا ہو تو اس کو مٹا دے۔''

---

[1] مشکوٰۃ ص ۱۸

[2] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۲۳

یہ روایت صحیح مسلم میں ہے' اس وجہ سے محدثین اس کو موضوع تو نہیں کہہ سکے' مگر چونکہ اس سے ان کی ساری بنیاد منہدم ہوئی جاتی تھی' اس لیے اس کی توجیہ یہ کی کہ مقصد اس ممانعت سے یہ تھا کہ قرآن مجید کے ساتھ کوئی دوسری چیز مخلوط نہ ہو جائے۔ لہٰذا جب التباس کا خوف نہ ہو تو کتابت جائز ہے۔ اس طرح پر رسول اللہ ﷺ کے منع کتابت حدیث کے واضح اور صریح حکم کو مٹا دیا۔ حالانکہ آپؐ نے اس کی کوئی علت بیان نہیں فرمائی تھی اور بلا کسی قید کے مطلقاً ممانعت کی تھی اگر حضور اکرمؐ کا یہ مقصد ہوتا کہ قرآن و حدیث مخلوط نہ ہونے پائیں' تو فرما سکتے تھے کہ دونوں کو الگ الگ لکھو۔ اس لیے محدثین کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہے بلکہ اصلی وجہ اس کی وہ ہے جو صحابہ کرام نے سمجھی' یعنی یہ کہ گذشتہ قومیں اپنے انبیاء کی روایات لکھنے کی بدولت گمراہ ہوئیں۔

انبیاء کرام اور خاص کر سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا لکھنا عقل و علم کی رو سے نہایت پسندیدہ اور مفید کام ہو سکتا تھا مگر یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ایسی عظیم الشان ہستیوں کے اقوال جمع و مدون کرنے کے بعد قوم میں ان ہی کو اصل دین قرار دے لیتی ہیں اور کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیتی ہیں۔ یہی راز تھا جس کی بنا پر حضورؐ نے کتابت روایت سے منع فرمایا تھا۔

محدثین نے جواز کتابت کے لیے بعض روایتوں سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ میں جو کچھ آنحضرتؐ سے سنا کرتا تھا لکھ لیا کرتا تھا' نیز عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق بھی ان کا بیان ہے کہ وہ لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کا خطبہ یمن کے ایک شخص ابوشاہ نے لکھوانے کی درخواست کی' تو حضورؐ نے لکھوا دیا۔ مگر یہ چیزیں مستثنیات میں شمار ہوں گی۔ عام حکم یہی تھا کہ قرآن کے سوا کچھ نہ لکھا جائے اور صحابہ کرام نے اسی کے مطابق عمل کیا چنانچہ ابوداؤد کتاب العلم میں ہے کہ ایک بار حضرت زید بن ثابت کاتب وحی امیر معاویہ کے پاس گئے۔ امیر موصوف نے ان سے ایک حدیث پوچھی جب حضرت زید نے بیان کیا تو انہوں نے ایک شخص کو اس کے لکھنے کا حکم دیا حضرت زید نے اس کو لے کر مٹا دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ آپ کی حدیثیں نہ لکھی جائیں۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعہ تقریباً پانچ سو حدیثوں کا لکھ رکھا تھا' ایک رات اس کے متعلق نہایت متردد اور مضطرب تھے۔ آخر صبح کے وقت اس کو لے کر آگ میں جلا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحیح مجموعہ اور کون ہو سکتا تھا' مگر صدیق اکبرؓ نے اس کا رکھنا بھی تقویٰ

کے منافی خیال کیا کہ شاید کوئی غلط روایت اس میں شامل ہوگئی ہو۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار خواہش کی کہ سنن (اسوۂ رسولؐ) کو لکھوالیں۔ صحابہ سے بھی مشورہ لیا۔ انہوں نے رائے دی۔ پھر وہ ایک مہینے تک اللہ سے دعا اور استخارہ کرتے رہے۔ بالآخر اس ارادہ سے باز رہے اور کہا کہ پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں اور ان ہی پر جھک پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔ [1]

فاروق اعظمؓ جس طرح روایت حدیث کو روکنے میں سخت تھے اسی طرح کتابت حدیث میں بھی۔ ان کے عہد میں جب حدیثیں زیادہ ہوگئیں تو اعلان کر دیا کہ لوگ ان کے پاس لائیں۔ پھر انہوں نے ان سب کو جلا دیا اور فرمایا کہ اہل کتاب کی مشاۃ کی طرح تم بھی مشاۃ بنانی چاہتے ہو؟ [2] (یہود نے اپنے انبیاء کی روایتیں جمع کر کے اس کا نام مشاۃ رکھا ہے)

دیگر صحابہ کرام کا طرز عمل مختصر جامع بیان العلم ص ۳۳ سے اقتباس کر کے لکھتا ہوں۔

''عبداللہ بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ میں ہر اس شخص کو جس کے پاس حدیث لکھی ہوئی ہو عہد دلاتا ہوں کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد اس کو مٹا ڈالے کیونکہ گزشتہ اقوام اسی وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے اپنے علماء کی روایات کی پیروی کی اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

ابونضرہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے پوچھا کہ جو حدیثیں ہم آپ کی زبان سے سنتے ہیں لکھ لیا کریں؟ فرمایا: کیا تم ان کو مصحف بنانا چاہتے ہو۔

حضرت زید بن ثابت کو خلیفہ مروان نے بلایا وہاں انہوں نے کچھ لوگوں کو حدیثیں لکھتے ہوئے دیکھا۔ ان سے فرمایا کہ ممکن ہے کہ روایت جس طرح تم سے بیان کی گئی ہے اس طرح نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک نوشتہ لایا گیا جس میں حدیثیں تھیں انہوں نے اس کو جلا دیا اور کہا کہ میں اللہ کا واسطہ دلاتا ہوں کہ جس شخص کو کسی کے پاس

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۳

[2] طبقات ابن سعد جزء خامس ص ۱۴۰

روایت کی کسی تحریر کی موجودگی کا علم ہو وہ ضرور آ کر مجھ کو بتا دے تا کہ میں وہاں پہنچوں۔ تم سے پہلے اہل کتاب اسی باعث ہلاک ہو چکے ہیں کہ انہوں نے اس قسم کے نوشتوں کے پیچھے اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

''حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی کتابت حدیث سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گزشتہ قوموں کی ہلاکت اسی وجہ سے ہوئی ہے۔ یہی حال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تھا''

عہد صحابہ کے بعد ائمہ تابعین بھی مثلاً علقمہ' مسروق' قاسم' شعبی' منصور مغیرہ اور اعمش وغیرہ کتابت حدیث کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

امام اوزاعی کہا کرتے تھے کہ ''حدیثوں کا علم جب تک زبانی تھا' شریف علم تھا۔ مگر جب سے لکھا جانے لگا' اس کا نور جاتا رہا اور نااہلوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا'' یہی وجہ تھی کہ تابعین کبار کے عہد تک حدیثیں غیر مدون تھیں اور سوائے قرآن مجید کے امت کے ہاتھوں میں کوئی دوسری کتاب نہ تھی بعض چیزیں محض علمی لحاظ سے لکھ لی گئی تھیں۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد خلافت میں جو صفر ۹۹ھ سے رجب ۱۰۱ھ تک تھا' سعید بن ابراہیم سے حدیثیں لکھوائیں اور مدینہ کے قاضی ابوبکر بن حزم کو فرمان بھیجا کہ عمرہ کی روایتیں لکھ لی جائیں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ ان کی وفات سے ان کا علم ضائع ہو جائے گا۔ یہ عمرہ حضرت عائشہ ام المومنین کی روایات کا علم رکھتی تھیں۔

حدیث کے مدون اول محدثین کے نزدیک امام ابن شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ تسلیم کیے گئے ہیں۔[1] یہ خلفاء بنی امیہ کے درباروں میں بہت معزز تھے اور ان ہی کے حکم سے انہوں نے حدیثیں لکھیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ہم کو حدیثوں کا لکھنا گوارا نہ تھا لیکن ان خلفاء نے مجبور کر کے لکھوایا۔[2]

امام زہری کے بعد ابن جریج نے مکہ میں' محمد بن اسحاق اور مالک بن انس نے مدینہ میں ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں' سفیان ثوری نے کوفہ میں اوزاعی نے شام میں' معمر نے یمن میں' ہشیم نے واسطہ میں' جریر نے رے میں اور ابن المبارک نے خراسان میں جو سب کے سب ایک ہی زمانہ میں تھے' حدیث کی کتابیں مدون کیں۔

---

[1] توجیہ النظر ص ۷

[2] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۸

یہ جملہ حضرات دوسری صدی ہجری کے ہیں' لیکن ان کی کتابوں میں سے جہاں تک علم ہے سوائے مؤطا امام مالک متوفی ۱۷۹ھ کے اور کوئی کتاب امت کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ اس کے بھی مختلف نسخوں میں صرف تین سو سے پانچ سو تک حدیثیں ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ امام مالک جب تک زندہ تھے ہر سال اس میں سے کچھ حدیثیں ساقط کر دیتے تھے۔[1] یہی وجہ ہے کہ اس کے مختلف نسخوں میں روایات کی تعداد مختلف نظر آتی ہے۔

ان ابتدائی تالیفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں' صحابہؓ کے اقوال اور تابعین کے فتاویٰ سب ملے جلے تھے۔ بعد کو لوگوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو الگ مدون کرنا شروع کیا۔ اس قسم کی تالیفیں مسند کہی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی مسند عبداللہ بن موسیٰ نے تیسری صدی کے آغاز میں لکھی۔ پھر مسدد بصری' اسد بن موسیٰ اور نعیم بن حماد وغیرہ نے۔ ان کے بعد کے طبقہ نے بھی ان ہی کی پیروی کی۔ مثلاً امام احمد بن حنبل' اسحاق راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ۔ چوتھے طبقہ میں امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے صرف صحیح حدیثوں کے مدون کرنے کی کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے شاگرد امام مسلم نیشاپوری متوفی ۲۶۱ھ نے بھی ان ہی کی پیروی کی۔ یہ دونوں کتابیں صحیحین کہی جاتی ہیں۔ اس زمانے سے کتابت حدیث محدثین کا عام مشغلہ ہو گیا اور مختلف نوعیتوں سے اس کی اس قدر کتابیں لکھی گئیں' جن کا شمار مشکل ہے۔

یہاں غور کے قابل یہ امر ہے کہ حدیثوں کی اگر دینی حیثیت ہوتی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اس شدت کے ساتھ اس کی کتابت کو نہ روکتے۔ بلکہ اس کے خلاف اس کی حفاظت کی کوشش کرتے۔

## وضعِ حدیث:

ہر چند رسول اللہ ﷺ نے بار بار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ "جو میرے اوپر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے"۔ اور یہ قول اتنے صحابہ سے مروی ہے کہ بعض محدثین نے اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے لیکن باوجود اس کے بھی ایسے لوگ تھے جو اسی زمانہ سے جھوٹی حدیثیں بیان کرنے لگے۔

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۷

توجیہ النظر صفحہ ۲۴۶ میں ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں ان کے اوپر جھوٹ بولا گیا اور عصر صحابہ میں بھی منافقین اور مرتدین تھے۔''

علاوہ منافقین اور مرتدین کے عہد صحابہ میں جب روایتیں عوام میں پھیلیں' تو مبالغہ اور کذب ان میں شامل ہوگیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ''بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباس کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ انہوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ بشیر نے پوچھا کہ کیا بات ہے جو آپ میری روایتیں نہیں سنتے؟ فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ اگر کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بیان کرتا تو ہم اس کی طرف لپکتے اور کان لگا کر سنتے مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب دیابس روایتیں کرنی شروع کیں۔ اس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا ہے۔''

صحابہ کے بعد بتدریج کذابین اور وضاعین کی کثرت ہوتی گئی۔ کیونکہ بنی امیہ کے زمانہ میں سلطنت اور مذہب میں تفریق ہو جانے کے باعث اہل روایت کے سروں پر فاروقی درہ نہ رہا اور ان کو موقع ملا کہ آزادی کے ساتھ سچی یا جھوٹی جس قسم کی روایتیں چاہیں' بیان کریں۔ خلفاء بنی امیہ بالعموم حدیث کو بہ نسبت قرآن کے اپنی سلطنت اور استبداد کے لیے زیادہ موجب عافیت سمجھتے تھے۔ انہوں نے خود حضرت علیؓ کو برسر منبر برا کہنے کی رسم ڈالی تھی اور سینکڑوں حدیثیں ان کے مثالب اور امیر معاویہؓ وغیرہ کے مناقب میں وضع کرائی تھیں۔ عہد عباسی میں تو ایک ایک خلیفہ کی پیشین گوئی اور مدح کی حدیثیں وضع ہوئیں۔ یہاں تک کہ یہ حدیث بھی پھیلائی گئی کہ کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان نہیں داخل ہوتا' جب تک کہ حضرت عباس اور ان کی اولاد سے محبت نہ رکھے۔[1] اور بنی امیہ کے خلاف تو ان کے دعاۃ آغاز تبلیغ ہی سے حدیثیں گھڑتے تھے۔ اس عہد میں کذب اور وضع کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ ہزاروں پیشہ ور کذاب پیدا ہو گئے جن کا رات دن یہی کام تھا کہ حدیثیں گھڑیں۔

بیشتر وضاعین اپنی وعظ گوئی اور قصہ خوانی کی وجہ سے عوام پر اس قدر اثر رکھتے تھے کہ نہایت مقدس اور بزرگ سمجھے جاتے تھے اور ائمہ حدیث ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں شعبی کا جو تابعین میں کوفہ کے سب سے بڑے امام حدیث تھے' بیان نقل کیا ہے کہ ''میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے لگا۔ اس میں ایک دراز ریش واعظ گھڑا ہوا تقریر کر رہا تھا کہ اللہ نے دو صور پیدا کیے ہیں۔ ہر ایک

---

[1] ترمذی کتاب المناقب

دو دو بار پھونکا جائے گا۔ میں نے جلدی سے نماز ختم کر کے اس سے کہا اے شخص اللہ سے ڈر اور جھوٹی حدیثیں نہ بیان کر۔ صور تو صرف ایک ہی ہے۔ وہ خفا ہوا اور بولا کہ کیسا فاجر آدمی ہے کہ بڑے بڑے آدمیوں کو جھٹلاتا ہے۔ اس کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ عوام مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے اور جب تک مجھ سے اقرار نہ لے لیا کہ اللہ نے تیس صور پیدا کیے ہیں اس وقت تک نہ چھوڑا۔

موضوعات کبیر میں ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ ایک قصہ گو نے مقام محمود کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے۔ امام ابن جریر طبری نے اس کی مخالفت کی اور اپنے دروازہ پر لکھ دیا کہ اللہ کا کوئی ہم نشین نہیں ہے۔ بغداد کے لوگ اس پر بگڑ گئے اور امام موصوف کے دروازہ پر اس قدر پتھراؤ کیا کہ اس کا منہ ڈھک گیا۔''

امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے جو ائمہ حدیث میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں' ایک بار بغداد کے محلہ رصافہ میں نماز پڑھی۔ مسجد میں ایک قصاص نے تقریر شروع کی کہ میں نے سنا احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے انہوں نے معمر سے' انہوں نے قتادہ سے انہوں نے حضرت انس سے اور انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جب کوئی بندہ لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو اللہ اس کلمہ کے ہر ہر حرف سے ایک ایک پرندہ پیدا کرتا ہے' جس کی چونچ سونے کی ہوتی ہے اور پر زمرد کے آخر تک تقریباً تیس ورق کی روایت۔ اس طویل داستان کو سن کر دونوں حضرات نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر یحییٰ بن معین نے قصاص کو اپنی طرف بلایا اور پوچھا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سنی ہے؟ اس نے کہا یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل سے انہوں نے کہا کہ میں یحییٰ ہوں اور یہ ابن حنبل۔ ہم دونوں میں سے کسی نے آج سے پہلے اس روایت کو سنا تک نہیں۔ تم کو اگر جھوٹ بولنا ہی تھا تو کسی اور کا نام لیا ہوتا۔ اس نے کہا میں نے سنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ پوچھا یہ کیونکر؟ بولا سترہ یحییٰ بن معین ہیں اور سترہ احمد بن حنبل' جن سے میں روایت کرتا ہوں۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ دنیا میں بس ایک تم ہی یحییٰ بن معین ہو؟ یہ سن کر انہوں نے آستین منہ پر رکھ لی اور چپ چاپ چلے آئے۔[1]

ان مذکروں اور واعظوں کی مقبولیت اس قدر تھی کہ جمہور ان ہی کو اپنا ہادی سمجھتے تھے اور ان ہی کی بات مانتے تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی والدہ کا قصہ ہے کہ انہوں نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام

---

[1] موضوعات کبیر

صاحب نے اس کا جواب دے دیا انہوں نے کہا کہ میں اس وقت تک نہیں مانوں گی جب تک کہ مسجد کوفہ کا قصاص زوعہ اس کی تصدیق نہ کرے۔ چنانچہ امام صاحب ان کو خود ساتھ لے کر گئے اور جب زوعہ نے کہہ دیا کہ فتویٰ صحیح ہے تب انہوں نے تسلیم کرلیا۔

امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں جعفر بن حاج سے نقل کیا ہے کہ محمد بن عبداللہ نے موصل میں پہنچ کر عجیب وغریب حدیثیں بیان کرنا شروع کیں۔ علمائے حدیث کو جب خبر ہوئی تو ان میں سے چند نے چاہا کہ چل کر اس کی تردید کریں۔ وہ ایک مجمع میں سرگرم تقریر تھا۔ جب علماء کو اپنی طرف آتے دیکھا تو معاملہ کو سمجھ گیا۔ فوراً ایک روایت حضرت جابر سے بیان کرنی شروع کردی کہ ''قرآن کلام اللہ ہے اور غیر مخلوق'' اب عوام کے خوف سے ان علماء کو جرأت نہ ہوسکی کہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہہ سکیں۔ [1]

یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کے خلاف اگر ائمہ حدیث کچھ کہتے تو ان کے معتقدین آکر بحث ومجادلہ کرتے۔ امام داؤد طائی نے اسی خوف سے روایت چھوڑ دی تھی اور کہا کرتے تھے کہ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور جب میں کچھ لکھوا دیتا ہوں تو میری غلطیاں نکالتے ہیں۔ امام اعمش کہتے ہیں کہ واللہ تم لوگوں نے حدیثوں کو رد کر کر کے میرے حلق میں ان کو عود سے بھی زیادہ تلخ بنا دیا ہے۔ تم جس کی طرف رخ کرتے ہو اس کو جھوٹ بولنا چھوڑتے ہو۔ اور ابن مزرع کہا کرتے تھے کہ جب کسی شیخ کو بھاگتا ہوا دیکھو سمجھ لو کہ اس کے پیچھے اصحاب حدیث ہیں۔'' [2]

سینکڑوں واضعین حدیث ایسے بھی تھے جو مخفی طور پر جھوٹی حدیثیں گھڑتے اور ان کو اپنی جماعت میں پھیلاتے۔ اگر ان کا پایہ اعتبار کم ہوتا تو بڑے بڑے ثقہ راویوں کے ناموں سے روایت کرتے۔ بعض ایسے بھی تھے جو اپنے شیوخ کے مشابہ خط میں اپنی مکذوبات چوری سے ان کی کتابوں میں درج کر دیتے۔ کچھ لوگ جہاد اور ثواب کا کام سمجھ کر حدیثیں بناتیں تھے۔ روایات کا تو کیا ذکر بعض بعض وضاعین نے تو حدیث کی پوری پوری کتابیں تصنیف کر ڈالیں جو اول سے آخر تک موضوع ہیں۔ اس قسم کی چند کتابوں کے نام اور ان کے حالات تذکرۃ الموضوعات میں ہیں۔

---

[1] کیونکہ اس زمانہ میں یہی بحث چھڑی ہوئی تھی جو عالم قرآن کو غیر مخلوق کہہ دیتا وہ عوام میں مقبول ہو جاتا پھر اس کی کوئی بات قابل تردید خیال نہ کی جاتی۔

[2] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۸۱۔۱۸۳

علامہ ابن جوزی نے وضع حدیث کے مندرجہ ذیل اسباب لکھے ہیں:

(۱) بعض لوگوں نے جن کے اوپر زہد غالب تھا' حفظ میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

(۲) بعض اہل علم کی یادداشتیں ضائع ہوگئیں اور انہوں نے مجبوراً حافظہ سے کام لیا اور جو خیال میں آیا کہہ گئے۔

(۳) بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دے دیا تھا' غلط روایتیں کیں۔

(۴) ایسے لوگ بھی تھے' جنہوں نے غلط راویتیں کر دیں اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے اس سے رجوع کرنا شان کے خلاف سمجھا۔

(۵) زنادقہ نے (یعنی ان عجمیوں نے جو بظاہر مسلمان ہوگئے تھے' لیکن در پردہ اسلام کو مٹانے کی فکر میں تھے اور عہد عباسی میں ان کی تعداد کچھ کم نہ تھی) ایسی حدیثیں گھڑیں جو شریعت کو فنا کرنے والی ہیں۔ [1]

(۶) جب مذہبی تفریق پیدا ہوئی اور سنی' شیعہ' خارجی' قدری' جہمی' مرجیہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے۔ اس وقت ان میں سے اکثر نے اپنی تائید اور دوسروں کی تردید میں حدیثیں وضع کیں۔

(۷) بہت سے عابد و زاہد لوگ ایسے تھے جو عوام کو کسی اچھے کام کی رغبت دلانے اور برے کام سے ڈرانے کے لیے حدیثیں گھڑتے تھے۔

(۸) بعض کا خیال یہ تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لیے اسناد ترتیب دے لینا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینا جائز ہے اور عملاً وہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ [2]

---

[1] یہ لوگ مدح کے پیرایہ میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو معیوب' قرآن کی آیات کو محرف اور شریعت کو ناقص دکھاتے۔ نیز اپنے عقائد کو اسلامی تعلیمات میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے' جن کا اثر آج بھی کتب تفسیر و حدیث میں باقی ہے۔

[2] تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ ایک محدث نے آخر عمر میں وضع حدیث سے توبہ کی۔ اس وقت اس نے کہا کہ حدیثوں کو ذرا دیکھ بھال کر قبول کیا کرو' کیونکہ ہم لوگ جب کسی بات کو اپنے حسب منشا پاتے تھے تو اس کو دین بنا لیتے تھے' یعنی رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

(۹) خلفاء و امراء کے مقربین اور حاشیہ نشین ان کے حسب منشاء روایتیں گھڑتے اور ان کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

(۱۰) قصہ گو واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کرتے تھے کیونکہ ان کی گرم بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ دس وجوہ ہیں جن کے باعث مکذوب و مجعول روایتیں امت میں پھیلیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں' حدیثیں بنائیں اور کبھی ان کو مخفی اور کبھی علانیہ مشرق سے مغرب تک پھیلایا اور ان سے بھی زیادہ ان جاہ پسندوں نے روایتیں گھڑیں جو اپنے علم و تقدس کا سکہ جما کر بزرگی اور عظمت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ان وضاعین اور موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی' جس کا اندازہ مشکل ہے' کیونکہ یہ وضاعین حدیث کی رگ رگ میں گھس گئے تھے اور اس کا کوئی باب اور کوئی شعبہ انہوں نے ایسا نہیں چھوڑا' جس میں اپنے حسب منشاء حدیثیں نہ تراشی ہوں۔ اور ایک ایک بیچ میں سو سو جھوٹ نہ ملایا ہو۔ پورے باب کے باب موضوع ہیں۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں' جن کی کوئی اصلیت نہیں۔ ملاحم (پیشین گوئیاں) مغازی (لڑائیاں) اور تفسیر۔ [۱] ان تینوں ابواب میں کس قدر حدیثیں ہیں؟ ان کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ خود امام موصوف کے ایک رفیق ابوزرعہ کو صرف تفسیر میں ایک لاکھ چالیس ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ [۲]

کذب کا تسلط یہاں تک ہوا کہ روایات تو کیا' کئی ایک موضوع صحابی بنا لیے گئے۔ تذکرۃ الموضوعات صفحہ ۱۰۲ میں ہے:

جملہ مورخین متفق ہیں کہ روئے زمین میں سب سے آخری صحابی جو رہ گئے تھے' وہ حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ ہیں جنہوں نے مکہ مکرمہ میں ۱۰۲ھ میں وفات پائی ان کے بعد چھٹی بلکہ ساتویں صدی ہجری میں طویل العمر صحابی مخترع کر لیے گئے' جن میں سے یہ لوگ ہیں:

(۱) جبیر بن حرب۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق مشہور تھا کہ غزوۂ خندق میں شریک

---

[۱] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۲

[۲] توجیہ النظر ص ۴

تھے۔ امیر عبدالکریم کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ ۵۷۳ھ میں ان کی زیارت کی تھی۔

(۲) ابوعبداللہ صقلی۔ پانچویں صدی ہجری میں تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے مصافحہ کیا ہے' اس لیے لوگ جا جا کر تبرکاً ان سے مصافحہ کرتے تھے۔

(۳) قیس بن تمیم گیلانی۔ ان کی پیشانی پر ایک نشان تھا' جس کی نسبت مشہور کیا گیا تھا کہ حضرت علیؓ کے خچر نے لات ماری دی تھی۔ چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں۔

(۴) بابارتن ہندی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ یہ ہندستان میں رہتے تھے ۶۲۲ھ میں وفات پائی۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کر کے ان کی زبانوں سے طرح طرح کی روایتیں امت میں پھیلائی جاتی تھیں۔ بعض لوگ سند عالی کے خیال سے ان کو اپنی بیاضوں میں درج کرتے تھے۔ [1] علماء کی ذہنیتوں کا حال یہ تھا کہ جب ائمہ حدیث ان خرافات کا انکار کرنے لگے تو ان کے ساتھ مجادلہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ امام ذہبی نے بابارتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجدالدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے اور حافظ ابن حجر نے جب ان باتوں کی تغلیط کی تو علامہ صغدی نے سختی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔

اس مختصر کیفیت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ روایان حدیث میں کذابوں اور وضاعوں کا عنصر کس قدر غالب تھا اور جمہور میں ان کی قدر دانی کی کتنی صلاحیت موجود تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ امت جس کے پاس قرآن جیسی کامل اور روشن کتاب ہو' کذب کے ایسے تاریک غار میں گر جائے۔

## تنقید حدیث:

جامعین حدیث نے جس وقت حدیثوں کو مدون کیا اس وقت جو کچھ بھی ذخیرہ روایات کا ان تک پہنچا تھا' کتابوں میں لکھ دیا۔ صرف خال خال روایتوں کو جن کا موضوع یا مکذوب ہونا بالکل ہی عیاں تھا'

---

[1] تذکرۃ الموضوعات کے صفحہ ۱۰۶ میں علامہ آق شہری کا قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چند ''رتنیات'' کی صحت پر وثوق نہیں مگر ان کی سند سے برکت حاصل کی جاسکتی ہے۔

چھوڑ دیا۔[1] یہ حدیثیں اسناد کے ساتھ جمع کی گئی تھیں، یعنی ان راویوں کے نام کے ساتھ جن کے ذریعہ سے پہنچی تھیں۔ اس کے بعد سے تنقید کا سلسلہ شروع ہوا اور صحیح یا غلط کی چھان بین ہونے لگے۔

اس تنقید میں ائمہ حدیث نے دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک متن حدیث کو دوسرے رواۃ کو موضوع متن کی شناخت کے لیے انہوں نے حسب ذیل اصول قرار دیے:

(۱) عقل کے خلاف ہو۔

(۲) فطرت کے خلاف ہو۔

(۳) قرآن کے خلاف ہو۔

(۴) تاریخ کے خلاف ہو۔

(۵) موقع یا قرینہ کے خلاف ہو۔

(۶) رافضی صحابہؓ کے یا خارجی اہل بیت کے مطاعن میں روایت کرتا ہو۔

(۷) چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو۔

(۸) واقعہ ایسا ہو، جس کے بیان کرنے والے بہت سے لوگ ہو سکتے ہوں مگر صرف ایک ہی شخص روایت کرتا ہو۔

لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکیں۔ کیونکہ جو لوگ حدیثیں تراشتے تھے، وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے تاکہ کہیں سے گرفت نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں محدثانہ تاویلات کا دروازہ ایسا کھلا ہوا تھا کہ جہاں کوئی روایت عقل یا قرآن وغیرہ کے خلاف معلوم ہوتی، فوراً مطابقت پیدا کر لی جاتی۔

لہٰذا یہ اصول جو غلط رواتیوں کو پہچاننے کے لیے مقرر کیے گئے تھے تقریباً بے کار ثابت ہوئے۔ اس لیے ان نقادوں نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی جانچ پر زیادہ مدار رکھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حضرات نبی تو تھے ہی نہیں کہ سوڈیڑھ سو سال سے ہزارہا وضاعین اور کذابین جو پیدا ہوتے چلے آ رہے تھے اور جن میں سے اکثر جمہور میں مقبول اور محترم بھی تھے ان کو الہام الٰہی سے شناخت کر لیتے۔ ان کے پاس ان کے

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۹

پہچاننے کا جو کچھ ذریعہ تھا وہ بھی روایات ہی کا تھا' یعنی ہر ایک راوی کے صدق و کذب کی بنیاد انہوں نے ان روایات پر رکھی جو اس کے متعلق لوگوں سے پہنچی تھیں۔

عہد صحابہؓ و تابعینؒ میں ضعفا اور کذابین کم تھے' اس وجہ سے ان کی بابت کلام بھی کم کیا گیا ہے۔ صرف امام شعبی' ابن سیرین اور سعید بن المسیب سے بعض کے متعلق جرح مذکور ہوئی ہے۔ دوسری صدی ہجری کے وسط میں امام اعمش اور مالک وغیرہ نے ضعفاء کا کھوج لگانا شروع کیا۔ پھر معمر' ہشام و ستوائی' اوزاعی' سفیان ثوری' ابن المبارک اور حماد بن سلمہ وغیرہ نے' ان کے بعد یحییٰ بن سعید القطان متوفی ۱۹۸ھ اور ابن مہدی رجال کے مستند امام بنائے گئے' لیکن ان کے زمانہ تک یہ علم زبانی تھا۔

تیسری صدی ہجری سے اس میں تدوین کتب شروع ہوئی' جن میں ایک ایک راوی کے حالات جمع کیے گئے اور اس کے اوپر جرح و تعدیل ہونے لگی۔ اس عہد کی نامور شخصیتیں دو ہیں: امام یحییٰ بن معین متوفی ۲۳۳ھ اور احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ' جن کے بعد یہ سلسلہ پھیل گیا اور اس فن کے سینکڑوں امام ہوئے اور اس میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ [1] مگر چونکہ صدق و کذب باطنی صفات میں سے ہیں' جن کے اوپر یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی' اس وجہ سے رواۃ کے متعلق بے حد اختلافات ہوئے۔ ہزاروں ہیں جن کو ایک اگر سچا کہتا ہے تو دوسرا جھوٹا۔

رہے ظاہری اوصاف یعنی زہد و عبادت وغیرہ تو ان کے متعلق خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ امام یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ اہل اصلاح و خیر سے زیادہ حدیث کے معاملے میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ اہل خیر کی زبان سے بلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے۔ ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم و زہد اور عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی۔ مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے معاملہ میں بھی گواہی دے تو میں قبول نہیں کروں گا۔ [2] اس لیے مجبوراً توثیق کی بنیاد محض مقبولیت اور شہرت پر رکھی گئی اور مقبولیت و شہرت کا یہ حال ہے کہ جو لوگ مسلم امام ہیں' وہ بھی جرح سے محفوظ نہیں ہیں' بلکہ جب ہم ان کے متعلق ان کے ہم عصر اماموں کی رائیں سنتے ہیں تو ہم کو ان کی امامت میں شک ہونے لگتا ہے۔ اس قسم کے چند اقوال حافظ ابن عبدالبر کی کتاب مختصر

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۱۴۔

[2] توجیہ النظر ص ۲۵۔

جامع بیان العلم کے صفحہ ۱۹۶ سے نقل کرتا ہوں:

''امام حماد بن ابی سلیمان جو امام ابوحنیفہؒ کے استاد ہیں جب مکہ کے سفر سے عراق میں واپس آئے اور لوگ ان کے پاس جمع ہوئے تو کہا کہ عراقیو! اللہ کا شکر کرو میں نے علماء حجاز کو دیکھا' واللہ تمہارے بچے بلکہ بچوں کے بچے ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں'' اور یہ علماء حجاز کون تھے؟ عطاء بن رباح' طاؤس' عکرمہ اور مجاہد وغیرہ جو سارے عالم اسلامی میں مستند مانے جاتے ہیں۔

ان ہی حماد کے استاد ابراہیم نخعی کا ذکر امام شعبی کے سامنے آیا تو انہوں نے کہا کہ وہ رات کو آ کر ہم سے پوچھتا ہے اور صبح کو فتویٰ دیتا ہے۔ امام ابراہیم نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ شعبی کذاب ہیں' وہ مسروق سے روایت کرتے ہیں حالانکہ ایک لفظ بھی ان سے نہیں سنا ہے۔

امام مغازی محمد بن اسحاق کے پاس امام مالک کا ذکر ہوا تو کہا کہ ان کی روایتیں میرے سامنے پیش کرو۔ میں ان کا بیطار ہوں۔ جب امام مالک نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ ابن اسحاق دجال ہے۔

ایک بار امام مالک سے کسی نے علماء عراق کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ ''ان کو بمنزلہ اہل کتاب کے سمجھو نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب (یہ علماء عراق کون تھے؟ امام ابوحنیفہ سے پوچھئے)

امام ابوحنیفہ اعمش کی بیمار پرسی کو گئے تھے۔ اٹھتے وقت کہا کہ اگر میرا آنا آپ کے اوپر گراں نہ گزرتا تو میں اس سے زیادہ عیادت کے لیے حاضر ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا تو اپنے گھر میں رہنا بھی میرے اوپر گراں ہے' چہ جائیکہ یہاں آنا۔ باہر نکل کر امام ابوحنیفہ نے کہا کہ اعمش کی نہ کبھی نماز ہوئی نہ روزہ۔''

اس قسم کی باتوں کے متعلق محدثین یہ کہتے ہیں کہ ہم عصر علماء میں باہمی رقابت رہا کرتی ہے' اس وجہ سے ان کے اقوال ایک دوسرے کی نسبت قابل اعتنا نہیں ہیں۔ اور ان سے کسی کی امامت میں فرق نہیں آتا۔ میں اس جواب کی صحت پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ان ائمہ کی رایوں پر جب معاصرانہ چشمک غالب آ جاتی تھی تو دوسرے جذبات کیوں نہیں غالب آ سکتے تھے۔ ہم تو صاف

دیکھ رہے ہیں کہ رواۃ کی توثیق صرف ان کے صدق کی بنا پر نہیں کی گئی ہے بلکہ استادی شاگردی اور ہم خیالی کے عواطف و میلانات بھی اس میں شریک ہیں۔ جہاں کسی امر میں اختلاف ہوتا ہے وہاں بڑے سے بڑے ثقہ پر بھی جرح ہو جاتی ہے۔ حارث ہمدانی مسلمہ طور پر ثقہ تھے جن کا کبھی جھوٹ ثابت نہیں ہوا مگر چونکہ حضرت علیؓ کی محبت کا اظہار کرتے تھے اس وجہ سے امام شعبیؒ نے ان کو کذاب کہہ دیا۔ [1] اور پھر رفتہ رفتہ وضاعین میں شمار کیے گئے۔ بہت سے لوگوں نے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق بعض اختلافات کی بنا پر کلام کیا۔ ابن ابی ذئب اور عبدالعزیز بن سلمہ وغیرہ نے چند مخصوص مسائل کی وجہ سے امام مالکؒ پر جرح کی۔ خود یحییٰ بن معین نے امام شافعی کو غیر ثقہ قرار دیا۔ [2] اسی طرح سینکڑوں ائمہ ہیں جو محض اختلاف خیال کے باعث مجروح کیے گئے اسی کا ماتم کرتے ہوئے ہارون الرشید کے عہد کے نامور شاعر ابوالعتاہیہ نے کہا:

بکی شجوہ الاسلام من علمائہ　　فما اکترتوا الماراومن بکائہ
فاکثرھم مستقبح لصواب من　　یخالفہ. مستحسن لخطائہ
فایھم المرجوفینا لدینہ　　وایھم الموثوق فینا لرائہ

(اسلام اپنے علماء کے دکھ سے رو پڑا اور انہوں نے اس کو روتے دیکھ کر بھی پروانہ کی۔ ان میں اکثر ایسے ہیں جو اپنے مخالف کی صحیح بات کو بھی بری اور اپنی غلط بات کو بھی اچھی سمجھتے ہیں لہٰذا ہم ان میں سے کس سے دین کی امید رکھیں اور کس کی رائے پر اعتماد کریں)

الغرض جرح و تعدیل کا فن سرتاسر قیاسی ہے اور اس قیاس میں بھی جذبات اور عواطف کے علاوہ تسامح سے کام لیا گیا ہے۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ:

"امام احمد بن حنبلؒ، ابن مہدی اور ابن مبارک تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایتوں کی جانچ میں سختی کرتے ہیں اور فضائل کی روایتوں میں نرمی۔"

شروع سے آخر تک ان میں نرم اور گرم دو فریق رہے ہیں۔ طبقہ اول میں امام شعبی سخت تھے اور سفیان ثوری نرم۔ دوم میں ابن مہدی نرم تھے اور یحییٰ بن سعید القطان سخت۔ سوم میں احمد بن حنبل

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۹۷

[2] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۰۱

بمقابلہ ابن معین کے نرم تھے اور چہارم میں ابو حاتم بمقابلہ امام بخاری کے سخت تھے۔

اس لیے رواۃ کی توثیق یا تضعیف تمام تر تخمین پر مبنی ہے اور صرف حدیثیں ظنی نہیں ہیں بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنی ہے اور یہ وہ بات ہے جس کو خود محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ ملا علی قاری موضوعات کبیر صفحہ ۱۶ میں لکھتے ہیں:

''یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی ہے' ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے' وہ صحیح ہو۔''

اس لیے کسی حدیث کی نسبت یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ قول رسولؐ ہے' بلکہ صرف یہ کہ وہ ایک قول ہے جو رسولؐ کی طرف منسوب ہے خواہ اس کی نسبت صحیح ہو یا غلط۔ امام مالک یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔[1]

اِنْ نَظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ

ہم تو صرف گمان کرتے ہیں ہم کو یقین نہیں حاصل ہے۔

پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ رجال اسناد کے ثقہ ثابت کرنے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ متن حدیث بھی صحیح ہو' اس لیے کہ وضاعین اپنی موضوعہ روایات کے ساتھ معتبر سند لگا دیتے تھے تا کہ کوئی ان کو غلط نہ کہہ سکے۔ ان کے پاس سترہ یحییٰ بن معین ہوتے تھے اور سترہ احمد بن حنبل' لہٰذا پہلا اصول تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ جو روایت جس سند کے ساتھ مروی ہے اس کی صحت کا ثبوت بہم پہنچایا جائے اور دوسرا یہ کہ جس کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ایک کا قول دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے اس کی کوئی روایت نہ تسلیم کی جائے' مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خلاف اس تدلیس کے عیب میں بڑے بڑے ائمہ مبتلا ہیں۔ مثلاً امام حسن بصری' مکحول شامی' سفیان ثوری' سفیان بن عیینہ' ابراہیم نخعی' مالک بن انس اور دار قطنی وغیرہ۔[2] اس لیے روایات کی تنقید کا یہ طریقہ بھی بے کار ثابت ہوا۔

علاوہ بریں یہ تقویٰ کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ کیونکہ جس امت کے ہاتھ میں قرآن جیسی

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ۱۱۳۔

[2] طبقات المدلسین لابن حجر

کتاب موجود ہے۔ جس میں "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" فرما کر اللہ نے دین اسلام کو مکمل کر دیا ہے' اس کو دین کی تلاش کے لیے کب جائز ہے کہ مرے ہوئے ائمہ اور رواۃ کے گڑے مردے اکھیڑ کر جرح وتعدیل کے مسلخ میں لائے اور ہر ایک کی پوست کشی کر کے اس کے صدق وکذب کا پتا لگانے کی کوشش کرے' وہ بھی محض لوگوں کے بیانات سے چنانچہ امام یحییٰ بن معین نے جب سب سے پہلے تاریخ الرجال لکھی اور اس میں سینکڑوں رواۃ حدیث کو جہاں ثقہ وصادق قرار دیا' وہاں ہزاروں کو کذاب اور دجال کہا۔ اس وقت علماء امت پر یہ امر اس قدر شاق گزرا کہ انہوں نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ بکر بن حماد شاعر نے کہا:

لِابْنِ معینٍ فی الرجال مقالة سیسئل عنها و المالک و شهید

فان کان حقًا قوله کان غیبةً وان کان زورًا فالقصاص شدید

(ابن معین نے لوگوں کے بارے میں باتیں کہی ہیں' جن کی بابت اللہ کے سامنے ان سے سوال کیا جائے گا۔ اگر وہ سچی ہیں تو غیبت ہیں اور اگر جھوٹی ہیں تو سزا سخت ہوگی) [1]

لیکن محدثین کو چونکہ حدیثوں کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لیے ایک معیار کی ضرورت تھی' اس وجہ سے انہوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اس سلسلہ کو بڑھا کر ایک مستقل فن بنا لیا اور آج تو وہ بڑے فخر کے ساتھ ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "مسلمان اس خصوصیت میں ممتاز ہیں کہ انہوں نے اپنے پانچ لاکھ علماء کے حالات محفوظ رکھے۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ لاکھ میں سے ایسے حضرات کے سوا جنہوں نے اعلائے کلمۃ الحق یا ملت کی تعمیر میں کارنامے چھوڑے ہیں۔ بقیہ کے متعلق جن کا کام سوائے روایت کشی کے اور کچھ نہ تھا' یہ دریافت کرنا کہ ان کا نام کیا تھا' ان کی کنیت کیا تھی' ان کے کون کون استاد تھے اور کون کون شاگرد' ان کی کس قدر روایتیں صحیح ہیں اور کس قدر غلط وغیرہ وغیرہ کوئی مفید یا قابل فخر تاریخی علم نہیں ہے بلکہ ملت کے لیے ایک قسم کی دماغی تعزیر ہے جو روایت پرستی کے سبب سے ملی ہے۔

---

[1] مگر شاعر کے خیال کے خلاف محدث نے یحییٰ بن معین کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ کیسی گزری؟ انہوں نے کہا اللہ نے مجھ کو چار سو حوریں بخش دیں۔ کتاب الاسماء جلد ا ص ۱۵۸۔

## اصول حدیث:

اصول حدیث سے یہاں میری مراد اس کی اصطلاحات نہیں ہیں' بلکہ وہ قواعد ہیں جن کو محدثین نے روایت میں مرعی رکھا یہ اصول تقریباً سب کے سب ناقص اور نظری حیثیت سے نہایت کم زور ہیں۔ اس موقع پر ان میں سے صرف دو اصولوں کو لیتا ہوں' جن سے حدیثوں کی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔

پہلا اصول روایت بالمعنی کا ہے' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایتیں کی گئی ہیں' وہ بلفظہ نہیں ہیں بلکہ بالمعنی ہیں۔ اور بلفظ ہو بھی کیسے سکتی تھیں' کیونکہ حضورؐ کی مجلس میں جو صحابہ موجود ہوتے تھے' وہ نہ آپؐ کی باتیں لکھا کرتے تھے' نہ یاد کر کے سنایا کرتے تھے۔ اور ان کو بیان کرنے کا موقع بھی ایک مدت بعد پیش آیا۔ اس وجہ سے ان کے لیے ان ہی الفاظ کو نقل کرنا جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے تھے' متعذر تھا۔ لہٰذا وہ اپنے الفاظ میں بیان کرنے لگے اور اس کو محدثین نے اصولاً جائز قرار دے دیا۔ اور روایت بالمعنی رائج ہوگئی۔ [1] حالانکہ بعض صحابہ ابن عمر جیسے اس کو ناجائز سمجھتے تھے اور وہ یا تو زبان بند رکھتے یا ان ہی روایات کو بیان کرتے تھے' جن کے الفاظ ان کو یاد ہوتے تھے' کیونکہ لفظوں کے بدل جانے سے معانی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو جاتی ہے جو روایت حدیث میں یقیناً تقویٰ کے خلاف ہے۔ حضرت عمران بن حصین نے کہا کہ دوسروں کی طرح اگر میں بھی روایتیں بیان کرنی چاہوں تو دو دن اور دو رات تک مسلسل بیان کر سکتا ہوں کیونکہ جس طرح ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنی ہیں' میں نے بھی سنی ہیں' مگر ڈرتا ہوں کہ ان ہی غلطیوں میں پڑ جاؤں گا' جن میں دوسروں کو پڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ [2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے الفاظ کی تبدیلی سے معانی بدلنے لگے تھے اور اختلاف پیدا ہونے لگے تھے اور اہل نظر و صلاح اس سے عبرت پکڑتے تھے۔

تابعین میں سے بعض ائمہ مثلاً ابن سیرین' مالک' قتادہ اور ابوبکر رازی کے سوا بالعموم محدثین روایت بالمعنی ہی کرتے تھے۔ امام سفیان ثوری نے کہا کہ:

---

[1] توجیہ النظر ص ۳۰۰

[2] توجیہ النظر ص ۱۱۔

''اگر میں تم سے کہوں کہ میری روایت کے الفاظ وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے' تو مجھ کو سچا نہ جانو۔ میں تو بالمعنی روایت کرتا ہوں۔[1]

یہی دوسرے محدثین بھی کہا کرتے تھے۔ قاضی بدرالدین نے اپنے استاد ابن مالک سے کہا کہ حدیثیں بالمعنی مروی ہیں اور رواۃ زیادہ تر عجمی ہیں' جو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ پھر ہم کس طرح معلوم کریں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا اصل مفہوم کیا تھا۔ وہ چپ رہے اور کچھ نہیں بولے۔[2]

ابوحیان نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ائمہ نحو نے جس قدر استشہاد کیا ہے' آیات سے کیا ہے' روایات سے نہیں۔ کیونکہ ان کو الفاظ حدیث پر وثوق نہیں تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔[3] اگر کسی روایت میں بعینہٖ الفاظ محفوظ ثابت ہو جائیں تو یہ اتفاقی امر ہے۔

روایات کے بالمعنی ہونے سے حدیثوں کی منزلت میں بہت فرق آ گیا' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت صرف معنوی رہ گئی اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ رواۃ کے الفاظ کہاں تک آپ کے بیان کے مدعا کے مطابق ہیں' اس لیے کہ کبھی کبھی صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے پورے کلام کا مفہوم بدل جاتا ہے اور یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ ایسی صورت میں الفاظ حدیث سے کسی خاص مقصد پر استدلال نہایت بے بنیاد ہے' کیونکہ معلوم نہیں کہ اصلی لفظ کیا تھا؟

دوسرا اصول خبر منفرد کی مقبولیت کا ہے' یعنی محدثین نے اس روایت کو جس کا راوی کسی درجہ میں صرف ایک ہی ہو' لیکن ان کے معیار کے مطابق ثقہ ہو' مقبول قرار دیا۔ علماء محققین نے اسی وقت اس کی مخالفت کی۔ ابراہیم بن اسماعیل نے کہا کہ روایت بمنزلہ شہادت کے ہے' اس لیے جب تک ہر درجہ میں کم سے کم دو راوی نہ ہوں قبول نہیں کی جا سکتی۔ معتزلہ اور خاص کر ابوعلی جبائی نے بھی نہایت سختی کے ساتھ ٹوکا' مگر محدثین نے کوئی التفات نہیں کیا' کیونکہ اس سے احادیث کے ایک بڑے حصہ سے ان کو دست بردار ہو جانا پڑتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ اور رازیؒ نے باوجود فلسفی اور معقولی ہونے کے بھی ان کے ساتھ موافقت کی ہے' حالانکہ قرآن میں جب معمولی لین دین پر جو دنیاوی امور ہیں' دو مسلمانوں کو گواہ بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے تو دینی امور میں کیوں دو گواہوں کی ضرورت نہیں ہے؟

---

[1] توجیہ النظر ص ۳۱۳۔۳۱۴۔

خود روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین گواہ طلب کرتے تھے قبیصہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک عورت آئی' جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تیرا حصہ نہیں پاتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے دادی کو سدس (۱/۶) دلوایا ہے۔ فرمایا کہ کوئی تمہارے اس قول پر شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں۔ اس وقت اس کو ایک سدس دلوا دیا۔ [1]

اسی طرح حضرت عمرؓ کے دروازہ پر ابوموسیٰ نے آواز دی۔ جب جواب نہ ملا تو واپس چلے اتنے میں فاروق اعظمؓ اندر سے نکل آئے اور پوچھا کہ آواز دینے کے بعد پلٹے کیوں؟ کہا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب تین بار پکارنے کے بعد جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ۔ فرمایا کہ گواہ لاؤ' ورنہ اچھی طرح خبر لوں گا۔ ابوموسیٰ کا رنگ خوف سے اڑ گیا بھاگے ہوئے مسجد کی طرف صحابہ کرامؓ کے پاس آئے' واقعہ سنایا اور کہا کہ کسی نے اگر سنا ہو تو میرے ساتھ چلے۔ چنانچہ ایک صحابی نے جا کر شہادت دے دی۔ تب حضرت عمرؓ نے ان کو چھوڑا۔ [2]

مگر عہد صحابہ میں عینی شاہد کا ملنا ممکن تھا۔ اس لیے اس وقت یہ طرز عمل بالکل حق بجانب تھا لیکن زمانہ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی' بلکہ مدعی کی ہو گئی۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کے جملہ افراد پر جن کی تعداد کروڑوں بلکہ ممکن ہے کہ اربوں ہو جائے۔ ایک عقیدہ یا عمل کی پابندی عائد کرنی چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطہ در واسطہ ہے' اس لیے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ دو شاہد عدل پیش کرے' جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سنا ہے۔ پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔ بلا ان کے اصول عدالت اور قانون شریعت کے مطابق اس کا قول تسلیم کے قابل نہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس جس قدر ذخیرہ روایات کا ہے' اس میں ایک روایت بھی ایسی ہے جو اس طرح شہادتوں سے ثابت کی گئی ہو یا کی جا سکتی ہو؟ اس لیے تمام روایتیں غیر یقینی ہیں۔ روایت کی صرف ایک قسم یقینی ہو سکتی تھی یعنی متواتر' جس کی تعریف حافظ ابن حجر نے نخبۃ الفکر میں یہ لکھی

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۲۔

[2] توجیہ النظر ص ۱۲۔

ہے:

''ایک تعداد کثیر جس کا عادتاً جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ہو اس کو روایت کرے اور ابتدا سے انتہا تک ان کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو اور اس کی بنا محسوس پر ہو اور اس سے بداہتاً سامع کو یقین حاصل ہو جائے۔''

یعنی خبر کے متواتر ہونے کے لیے چار شرطیں ہیں:

(۱) اس کے راویوں کی تعداد اتنی کثیر ہو کہ ان کا کذب پر باہم اتفاق کر لینا عادتاً ناممکن ہو۔

(۲) ابتدا سے انتہا تک ہر درجہ میں اس کے راویوں کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو۔ کسی ایک درجہ میں بھی اس سے کم ہوگی تو وہ متواتر نہ رہے گی۔

(۳) خبر متواتر کا مبنیٰ محسوس ہو۔ اگر غیر محسوس ہوگا تو متواتر نہ ہوگی۔ مثلاً مکہ ایک شہر ہے۔ اس کو بیان کرنے والے خواہ ہزار ہی آدمی کیوں نہ ہوں' یہ خبر متواتر اور یقینی ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر کروڑوں آدمی کہیں کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں تو یہ خبر متواتر نہ ہوگی کیونکہ اس کا مبنیٰ غیر محسوس اور محض اعتقادی ہے۔

(۴) اس خبر کو سنتے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے۔

ایسی حدیث جس میں یہ چاروں شرطیں پائی جائیں' متواتر اور مفید یقین ہوگی اور اسی کو علماء معقول یعنی منطقیوں نے یقینیات میں شمار کیا ہے' لیکن اس قسم کی متواتر حدیث کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن صلاح نے جو باوجود اس کے کہ حدیث کے معاملہ میں نہایت خوش اعتقاد ہیں' لکھا ہے کہ اس تعریف کے مطابق متواتر حدیث کا ملنا مشکل ہے۔ حافظ ابن حجر ان کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ایسی حدیثیں مل سکتی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جن تین چار حدیثوں کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے' ان میں تواتر لفظی نہیں بلکہ معنوی[1] ہے۔ علاوہ بریں انہوں نے تواتر کا مفہوم ہی بدل دیا ہے اور مشہور حدیث کو متواتر قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ جس کے یقینی ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی صحابی یا امام نے کوئی روایت کی جس کے بعد اس کے بیان کرنے والے حد شمار سے زیادہ ہو گئے تو وہ متواتر نہ ہوگی۔ کیونکہ اس میں رواۃ کی تعداد اول سے آخر تک یکساں نہیں ہے۔ جو لوگ فرط عقیدت

---

[1] توجیہ النظر ص ۴۷

سے صحیحین کی روایتوں کو متواتر کہنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً امام ابن تیمیہ یا ابن صلاح' ان کے ساتھ اس حد تک تو موافقت کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مصنفین تک متواتر ہیں' مگر ڈھائی سو سال کا زمانہ جو ان سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہے' اس میں خبر واحد ہی تھیں۔ زیادہ صاف لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ خبر متواتر وہ ہے جس سے بداہتاً یقین حاصل ہو اور وہ دعویٰ' دلیل اور سند کی بھی محتاج نہ ہو اور ایسی کوئی حدیث نہیں ہے' بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں اور ائمہ اصول نے تصریح کی ہے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں ہے۔

## دلائل حدیث:

محدثین نے حدیث کی دینی حیثیت پر آیات قرآنی سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے' اس لیے ان کے جوابات بھی لکھنے ضروری ہیں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

امام شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے جو حدیث کو دینی حجت نہیں مانتی تھی اور ان میں سے ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے۔ اس نے امام موصوف سے سوال کیا کہ:

> ''قرآن کریم نے جو فرائض امت پر عائد کیے ہیں' ان میں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو' کسی کو خاص' کسی کو لازم اور کسی کو مباح۔ اور یہ سب کچھ ان روایات کی بنا پر کرتے ہو جو ایسے لوگوں سے مروی ہے' جن میں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا نہ ان سے ملے اور باوجود ان کی عدالت اور ثقاہت کے قائل ہونے کے بھی تم ان میں سے کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے ہو کہ وہ غلطی' غلط فہمی' خطا اور نسیان سے بھی بری ہے۔ پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ ان کی بنا پر احکام الٰہی میں تفریق ڈالتے ہو۔''

امام صاحب نے جو جواب دیا' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے اور سنت وہ ہے جس کو قرآن نے **یعلّمھم الکتٰب والحکمۃ** میں حکمت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ نیز دوسری آیت ہے۔

**مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَانَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔** (۵۹/۸)

رسول جو کچھ تم کو دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔

اس سے سنت کی دینی حیثیت ثابت ہے۔اس کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سن کر اس نے اپنے قول سے رجوع کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس مفکر کے قائل کر دینے کو ہم امام شافعی کی کرامت ہی سمجھتے ہیں' ورنہ ان سے تو اس کے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہ ہوا' کیونکہ اس کا اعتراض نفس روایت اور ذریعہ روایت کے متعلق تھا کہ وہ مشتبہ ہے اس لیے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔

علاوہ بریں حکمت کا مفہوم جو انہوں نے حدیث کو قرار دیا کسی طرح صحیح نہیں۔حکمت ایک عام لفظ ہے' جس کے معنی ہیں دانائی کی باتیں۔خود قرآن کی صفت بھی حکیم ہے' یعنی اس میں حکمت کی باتیں ہیں' جیسا کہ جا بجا آیات میں تصریح ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (۴/۱۱۲)

اور اللہ نے تجھ پر کتاب و حکمت نازل فرمائی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں تورات کے احکام عشرہ کے مقابل تیرہ احکام نازل کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا:

ذٰلِكَ مِمَّا اوحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ. (۱۷/۳۹)

یہ حکمت کی۔ان کتابوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

خود اس منکر نے اعتراض کیا تھا کہ ازواج رسولؐ کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ. (۳۴/۶۳)

اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں جو تلاوت کی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔

جس سے معلوم ہوا کہ حکمت قرآن میں شامل ہے' ورنہ حدیثوں کی کون تلاوت کرتا ہے مگر امام صاحب نے اس کی طرف توجہ نہ فرمائی' حالانکہ خود ان کا قول ہے کہ حدیثیں منزل من اللہ نہیں ہیں' بلکہ استنباطات نبویہ ہیں' یعنی قرآنی آیات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سمجھا اور فرمایا۔[1] پھر جس

---

[1] اتقان جلد۲ ص ۱۳۰

حکمت کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ حدیث کیسے ہوسکتی ہے؟ قرآن میں ہے کہ ''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی'' کیا لقمان کو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں دی گئی تھیں؟

دوسری آیت "مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ" جوانہوں نے پیش کی اوران کی تقلید میں آج تک علماء حدیث پیش کرتے چلے آتے ہیں' وہ مال فئے (غنیمت بلا جنگ) کی تقسیم کے بارے میں ہے۔ حدیث سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہاں "اٰتا" کے لفظ کو جو "نھٰی" کے بالمقابل واقع ہے' لوگوں نے غلط فہمی سے اَمَرَ یا قال کے معنی میں سمجھ لیا حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سینکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا ہے' بلکہ ہر جگہ اس کے معنی "اعطا" یعنی ''دینے'' ہی کے ہیں' لہٰذا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔

تیسری دلیل بعض حضرات کی یہ ہے کہ سورۃ والنجم میں ہے:

مَایَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی.

رسول اپنے نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے۔

لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو نکلتا تھا' سب وحی تھا لیکن یہ استدلال حقیقت فہمی سے بہت دور ہے' کیونکہ یہاں ذکر ہے اس کلام کا جو بذریعہ وحی کے اترتا تھا اور جس سے کفار کو انکار تھا اور وہ صرف قرآن ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانگی امور میں ازواج مطہرات سے یا عام معاملات میں دوسرے لوگوں سے رات دن جو گفتگو فرماتے تھے' اس کے وحی ہونے کا نہ دعویٰ تھا' نہ اس کے متعلق کوئی بحث تھی۔ مخالفت صرف قرآن کی تھی اور وہی بذریعہ وحی کے نازل کیا گیا تھا جس کی تصریح اس آیت میں ہے:

وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ. (۶/۲۰)

اور میری طرف یہ قرآن اتارا گیا ہے کہ میں تم اس کے ذریعے سے آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُکُمْ بِالْوَحْیِ. (۲۱/۴۵)

کہہ دے کہ تم کو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایہ انذار صرف قرآن ہے اور وہی لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے وحی کیا گیا ہے۔ اسی کو آنحضرتؐ نے لکھوایا اور لوگوں کو یاد کرایا۔

بعض لوگوں نے وحی کی دو قسمیں کر ڈالی ہیں۔ متلو اور غیر متلو یا جلی اور خفی ایک کو قرآن کہتے ہیں ایک کو حدیث' لیکن یہ ان کی محض خیالی اصطلاح ہے۔ جس کو قرآن سے کوئی سروکار نہیں۔ حدیثیں بھی اگر وحی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو قرآن کی طرح لکھایا کیوں نہیں؟

چوتھی دلیل جو بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کی جاتی ہے' یہ ہے کہ بیسیوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اطاعت رسولؐ کا حکم دیا ہے۔ اگر چہ حدیثیں دینی حجت نہ ہوں' تو یہ اطاعت کس طرح ہوگی؟ دراصل یہی سب سے بڑی غلط فہمی ہے جو حدیثوں کو دین بنانے کا موجب ہوئی ہے' میں نے اس مبحث پر ایک مفصل مقالہ ''اسلامی نظام'' کے عنوان سے لکھ دیا ہے جو شائع ہو چکا ہے' اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں مختصراً صرف اس قدر لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں:

(۱) پیغمبری' یعنی پیغامات الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔ یہ پیغمبری آپ کی ذات پر ختم ہوگئی۔

(۲) امامت' یعنی امت کا انتظام۔ اس کو قرآن کے مطابق چلانا اس کی شیرازہ بندی' ان کے باہمی قضایا کے فیصلے' تدبیر مہمات و جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔

یہ امامت کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے لیے قائم ہوئی' قیامت تک مستمر ہے' جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ رہنی چاہیے۔ قرآن میں اطاعت رسولؐ کے جو احکام ہیں' وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لیے ہیں' جسمیں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں۔ ان کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت ہے اور رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسولؐ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے' اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز و ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمدؐ امت میں موجود تھے ان کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت تھی (اور یہ امت ہمیشہ آپؐ ہی کی امت رہے گی۔ کیونکہ آپؐ کے اوپر ایمان لائی ہے) اور آپؐ کے بعد آپؐ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسولؐ کی اطاعت ہوگی اور اطاعت عربی میں کہتے ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو۔ رسولؐ کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کچھ کہہ دے' ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں۔ یہ ذہنیت امت میں اس وقت پیدا ہوئی جب کوئی صحیح خلیفہ رسولؐ نہیں رہا اور مستبدوں نے مرکز پر تغلب حاصل کر کے امت کو اپنا غلام بنا لیا اور ان

کی دینی قیادت چھوڑ دی جو علما اور رواۃ حدیث نے لے لی۔ اسی دن سے امت مذہبی انفرادیت اور انتشار میں مبتلا ہوگئی' ورنہ دین کی ضروریات قرآن کے اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ امام کے ساتھ امت کے منتخب افراد ہوں گے جن کی مشاورت سے وہ اس کو حسب اقتضائے زمانہ قرآن کے مطابق چلائے گا اور اس میں وحدت مرکزی قائم رکھے گا اور متفرق نہ ہونے دے گا۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو قرآن کا مخاطب قرار دیا ہے۔ وہ انسانی عقل ہے جس میں اس نے فکر ونظر کی قوت ودیعت فرمائی ہے اس کی ہدایت کے لیے جس قدر روشنی کی ضرورت ہے اس کتاب میں رکھ دی ہے جو ہر زمان ومکان میں اس کی راہنمائی کے لیے کافی ہے اور کسی ماحول کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی' بخلاف روایات کے جو ماضی کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہیں۔

پانچویں دلیل ان کی یہ ہے کہ قرآن میں نماز کے اوقات' تعداد رکعات' نصاب زکوٰۃ اور روزہ اور حج کی تفصیلات کہاں ہیں؟ لہذا اگر حدیثیں دین نہ مانی جائیں تو یہ باتیں ہم کو کیونکر معلوم ہوں گی؟

ہر چند کہ یہ قرآنی حجت نہیں ہے بلکہ الزامی ہے مگر چونکہ حامیان حدیث کی زبانوں پر سب سے پہلے یہی آتی ہے' اس لیے اس کا ازالہ ضروری ہے۔

بے شک قرآن کریم نے ان تفصیلات کو اپنے ذمہ نہیں لیا مگر اس نے اپنے احکام کی عملی تشکیل رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دی اور فرمایا۔ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ". تمہارے لیے رسول کی ذات میں اچھا نمونہ ہے حضور اکرمؐ نے اس کے احکام پر عمل کر دکھلا دیا اور ان کی تفصیلات امت کو سکھلا دیں۔ وہ عملی نمونے سلسلہ بہ سلسلہ متواتر چلے آ رہے ہیں اور بالکل یقینی ہیں۔ ان کے لیے غیر یقینی روایات کی کیا ضرورت ہے ان کی وجہ سے تو کہیں کہیں اس تواتر میں بھی اختلافات پڑ گئے ہیں جو مٹائے نہیں مٹتے۔

چھٹی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ کتاب کی تعلیم وتبیین کا فریضہ آنحضرتؐ کے ذمہ تھا لہذا احدیثیں دینی ہیں' کیونکہ وہ قرآن کی تفسیر ہیں۔

لاریب آپ کی تعلیم وتبیین دینی ہے' لیکن وہ وہی عملی تشریح یعنی اسوۂ حسنہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا' ورنہ آیات کی تفسیر میں جو حدیثیں نبی کریم ﷺ کے نام سے روایت کی گئی ہیں' ان کے متعلق تو خود ائمہ حدیث کا بیان ہم نقل کر چکے ہیں کہ بے اصل ہیں۔ ان سے قرآن کی تفسیر کرنا ان کی قطعیت کو کھونا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نور مبین اور مفصل کتاب ہے جس کو اس کے اولین مخاطب یعنی صحابہ کرامؓ بے تکلف سمجھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو اس کے الفاظ و معانی کی تشریح کی ضرورت بہت کم پیش آئی۔ کل زمانہ نبوت میں قرآنی تعلیمات کے متعلق صحابہؓ نے جس قدر باتیں پوچھیں وہ امام رازی کے بیان کے مطابق ۱۴ اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں صرف ۱۲ ہیں۔ ان سب کے جوابات قرآن ہی میں نازل کیے گئے۔ جو علامہ سیوطی کی اتقان میں نیز مختصر جامع بیان العلم کے آخری صفحہ میں ایک ایک کر کے گنا دیئے گئے ہیں۔ بلکہ ہر شخص قرآن میں **یسئلونک** اور **یستفتونک** کے الفاظ سے خود بھی ان کو شمار کر سکتا ہے۔

## قرآن و حدیث:

اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن ہی کو ایمانی کتاب قرار دیا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ. (۲/۲۸۵)

ایمان لایا رسول اس پر جو اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین بھی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو اسی کتاب پر ایمان رکھنے کی ہدایت کی ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا. (۲/۱۳۶)

کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اتاری گئی۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ من كتاب (۴۲/۱۵)

اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس کتاب پر جو اللہ نے اتاری۔

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے اور سارے قرآن میں کتاب اللہ کے سوا کسی حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا. اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. (۳۱/۹)

اور بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بلا علم (یقین) کے بھٹکا دیں اور اس کو مذاق بنالیں۔ یہ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے

والا عذاب ہے۔

آیت میں حدیث کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

(۲) اس کی بنیاد علم یعنی یقین پر نہیں ہے۔

(۳) اس سے اللہ کی راہ یعنی دین کو مذاق بناتے ہیں۔

اس لیے جن لوگوں نے اس لفظ کی تفسیر غنا یعنی راگ کے ساتھ کی ہے ان کا قول صحیح نہیں ہے' کیونکہ راگ سے غرض نشاط و طرب ہوتی ہے نہ کہ گمراہ کرنا یا اللہ کی راہ کو مذاق بنانا اور نہ اس کو علم یعنی یقین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف قصص و روایات ہیں' جو اس کے ذیل میں آتے ہیں۔

جس طرح قرآن ہی ایمانی کتاب ہے اسی طرح وہی دستور العمل بھی ہے اور اسی کی پیروی کا حکم ہے:

اِتَّبِعْ مَااُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ. (۶/۱۰۶)

پیروی کر اس کی جو تیری طرف تیرے رب کے پاس سے وحی کی گئی۔

اور رسولؐ کو اس کے اعلان کر دینے کی ہدایت ہے۔

قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَایُوْحٰی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ. (۷/۳)

کہہ دے کہ میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے پاس سے میری طرف وحی آتی ہے۔

اور امت کے لیے یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ:

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ. (۷/۳)

اس کی پیروی کرو جو تمہاری[1] طرف تمہارے رب کے پاس سے اتارا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

مرکز یعنی امام کو حکم دیا گیا کہ اسی کتاب کے ذریعہ سے لوگوں میں حکم رائج کرے:

---

[1] یہ قرآن رسول کریمؐ کے توسط سے ساری امت کے لیے نازل ہوا ہے "اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ" (۳۹/۴۱) (ہم نے تیرے اوپر کتاب انسانوں کے لیے نازل کی ہے حق کے ساتھ)

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۵۵)

ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے۔

اور جو کوئی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ فاسق ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. (۵/۵۳)

اور جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

اور قرآن ہی کی تبلیغ رسول کا فریضہ قرار دی گئی:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ. (۵/۶۷)

اے رسول جو کچھ تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو (لوگوں کو) پہنچا دے اور اگر تو نے (یہ) نہ کیا تو اس کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

یہی قرآن سرمایہ انذار ہے:

وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ. (۶/۱۹)

اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم کو آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ. (۲۱/۴۵)

کہہ دے کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تم کو آگاہ کرتا ہوں۔

الغرض یہی نور مبین یعنی قرآن کریم ہے جس کی روشنی میں نبی خود چلتا تھا اور سب کو چلاتا تھا۔ اسی آفتاب حقیقت نے اس کے افق قلب پر طلوع ہو کر اس کو سراج منیر بنایا تھا۔ یہی اس کا سامان تعلیم و تبلیغ اور سرمایہ بشارت و انذار تھا اور اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا' یعنی ان کو کفر و شرک کی ظلمت سے نکال کر اسلام اور ایمان کی روشنی میں لاتا تھا:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ. (۱۴/۲)

عظیم الشان کتاب ہم نے تیری طرف اتاری ہے کہ تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اور اسی کے ذریعہ سے جملہ امور اور قضایا کے فیصلے کرتا تھا:

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىکَ اللّٰهُ.
(۴/۹۷)

ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ کہ جو اللہ تجھ کو سمجھائے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرے۔

یہی کتاب سرتا سر یقینی ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْهِ (۲/۲)

یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔

دین میں غیر یقینی چیزوں کی پیروی ممنوع قرار دے دی:

وَلَا تَقْفُ مَالَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ. اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا. (۱۷/۳۷)

جس چیز کا تجھ کو یقین نہیں اس کے پیچھے نہ چل۔ کان آنکھ اور دل ہر ایک سے اس کی باز پرس ہوگی۔

اور ظنی امور کے متعلق فرمایا کہ:

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۵۳/۲۸)

ظن حق کی جگہ کچھ کام نہیں دیتا۔

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ.
(۷/۱۱۷)

روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی بات مانے گا تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے وہ تو صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں۔

یہود نے اپنے احبار کی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے اعتماد پر وہ کہتے تھے کہ دوزخ ہم کو چند دنوں سے زیادہ نہیں جلا سکتا قرآن نے کہا:

وَغَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ. (۳/۲۴)

ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے ان باتوں نے جن کو وہ اپنے دین میں گھڑتے تھے۔

الغرض مسلمانوں کے ایمان اور ان کے انفرادی اور اجتماعی اعمال دینی کا مدار قرآن کریم ہی پر رکھا

گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جو کچھ فرمایا یا عمل کیا اس سے مقصود قرآن ہی کی تعلیم اور تعمیل تھی۔ ان میں سے جو چیز (مثلاً اسوۂ حسنہ) تواتر عمل کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے' یقینی اور دینی ہے اور جو چیز روایتاً خبر واحد کے سلسلہ سے آئی ہے' ظنی اور تاریخی ہے۔

## عقل اور حدیث:

عقل کی رو سے دیکھا جائے تو حدیثوں کی دینی حیثیت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ وہ بسلسلہ سند مروی ہیں مثلاً میں نے سنا زید سے' اس نے عمرو سے' اس نے بکر سے' اس نے خالد سے' اس نے اصغر سے اس نے اکبر سے الخ ایسا بیان جو اتنے واسطوں سے آئے' نہ شہادت ہے نہ علم ہے اور سوائے ظن کے یقین کے درجہ تک نہیں پہنچتا کیونکہ اگر ایک شخص جس سے میں واقف ہوں مجھ سے کوئی بات بیان کرے تو میں اس خیال کے مطابق جو اس شخص کی بابت میرے دل میں ہے' اسکی بات کے سچ یا جھوٹ ہونے کا فیصلہ اپنے قیاس سے کر سکتا ہوں' لیکن جب اس نے کہا کہ میں نے اس کو زید سے سنا ہے تو میرے پاس کہ میں زید سے واقف نہیں ہوں' کوئی معیار اس کے جانچنے کا نہیں رہ گیا۔ اب وہ خود اپنے اس اعتماد کے مطابق جو زید کے متعلق وہ رکھتا ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگا سکتا ہے اور جب اس نے یہ کہا کہ زید نے اس کو عمرو سے سنا تھا تو اب اس کے پاس بھی کوئی کسوٹی نہیں رہ گئی' اس لیے ایسے اقوال جو بسلسلہ سند مروی ہوں' قائل یا سامع کسی کے لیے بھی حجت نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بابت یہی کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کے واسطہ سے یہ مروی ہیں وہ معتبر لوگ تھے' لیکن یہ اعتماد بھی میرا اور قائل کا نہیں بلکہ اس کی بنیاد ان بیانات پر ہے' جو اسکے راویوں کے ہمعصروں کے ہیں' اس لیے یہ اعتماد ایک تاریخی چیز ہے اس تاریخی بنیاد پر سوائے تاریخ کے دین کی تعمیر نہیں ہو سکتی کیونکہ تاریخ ظن پر قائم ہوتی ہے مگر دین یقین کا طالب ہے جو روایات میں بجز متواتر کے نایاب ہے۔ [1] اور متواتر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں' کوئی حدیث نہیں ہے' بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں جن کے متعلق علماء اصول کا اتفاق ہے کہ وہ صحیح ہونے کی صورت میں بھی یقین کے درجہ تک نہیں پہنچتیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اصول کی بہترین کتاب المستصفی جلد اول صفحہ ۱۴۵ میں لکھتے ہیں:

---

[1] یہ یاد رہے کہ قرآن کریم اور اسوۂ حسنہ تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں' ان کے متعلق یہ بحثیں نہیں ہو سکتیں۔

**خبر الواحد لا یفید العلم**

خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔

خبر واحد سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی اسی صفحے میں دیکھیے۔

**انا نرید بخبر الواحد فی ھذالمقام مالاینتھی من الاخبار الی حد التواتر المفید للعلم. فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ اوستۃ مثلاً فھوا خبر الواحد.**

اس مقام پر خبر واحد سے ہماری مراد وہ حدیث ہے کہ حد تواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے مثلاً ایک حدیث جس کو کوئی جماعت پانچ یا چھے راویوں سے روایت کرتی ہو خبر واحد ہے۔

پانچ چھے تو مثال کے طور پر کہا ہے جب تک کوئی روایت تواتر کی چاروں شرطیں جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں پوری نہ کرتی ہو خواہ وہ سینکڑوں راویوں سے کیوں نہ مروی ہو غیر متواتر اور خبر واحد ہی رہے گی۔

حدیث کی بابت ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس کی تدوین کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا جب کہ بنی امیہ نے مسلمانوں کو غلام بنا لیا تھا۔ اس کے کل مجموعے جو آج امت کے ہاتھوں میں ہیں ان میں سے کوئی بھی اس سے قبل کا نہیں ہے بلکہ صحاح ستہ یعنی حدیث کی چھے کتابیں جو اہل سنت میں مقبول ہیں تیسری صدی ہجری کی مرتب کی ہوئی ہیں اور بنی امیہ کے عہد میں چونکہ خلفاء نے دینی قیادت چھوڑ دی تھی اور وہ محدثوں اور راویان حدیث کے ہاتھوں میں آ گئی تھی اس وجہ سے امت میں ان کی عظمت و شان قائم ہوتی تھی جس کو دیکھ کر ہزاروں دنیاداروں نے روایت کو بطور پیشہ کے اختیار کر لیا تھا اور جمہور میں مقبول اور محترم ہو گئے تھے۔ ان میں سے مختلف طبقات نے اپنے اپنے اغراض سے وضعی حدیثیں بنائیں امت میں ان کو پھیلایا۔ بعد میں جو ائمہ حدیث ان کی تنقید کے لیے کھڑے ہوئے ان کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا جس سے کھری کھوٹی حدیثوں کو پرکھ کر الگ الگ کر سکتے۔ اس وجہ سے ان کی صحیح قرار دی ہوئی حدیثیں بھی مشتبہ رہیں۔ چنانچہ غیر مسلم معترضین اسلام پر جس قدر اعتراضات کرتے ہیں ان میں سے اکثر کی بنیاد ان حدیثوں پر ہوتی ہے جن کو مسلمانوں نے صحیح سمجھ کر تسلیم کر لیا ہے مگر اصل میں وہ موضوع ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ائمہ حدیث نے تصریح کی ہے کہ حدیث کے معاملہ میں حسن ظن جائز نہیں ہے بلکہ ان کا جانچنا اور پڑھنا ضروری ہے کیونکہ حدیث خبر ہے جس میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے خود اس کی تنقید میں کوششیں کیں۔ اس سے بداہتاً ظاہر ہو جاتا ہے کہ حدیثیں علمی تنقید کے تحت میں ہیں اور ان کا درجہ

دینی نہیں ہے کیونکہ دینی امور یقینی اور تنقید سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اللہ نے رسولوں پر ایمان لانے کا اسی وجہ سے حکم دیا ہے کہ اس کے بعد ان کے لائے ہوئے پیغامات میں شک نہ واقع ہو سکے۔ بخلاف اس کے راویان حدیث پر ایمان لانے کا کوئی حکم نہیں ہے' جو ان کی روایات کی تصدیق ضروری ہو۔ روایات تو کیا خود ہزاروں راوی ایسے ہیں جن کو ایک اگر سچا کہتا ہے تو دوسرا جھوٹا کہتا ہے اور ہم کسی کی گرفت نہیں کر سکتے کیونکہ تنقید میں ہر شخص اپنے ضمیر کی آواز میں آزاد ہے۔ اس وجہ سے روایات کی تنقید علمی ہے اور ان کا درجہ تاریخی ہے۔ وہ دینی حجت نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے جو قرآن کریم اور عمل متواتر کے مطابق ہوں گی قبول کی جائیں گی۔

## رتبہ حدیث:

گزشتہ ابواب پر نظر ڈالنے سے حسب ذیل امور نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں:

(۱) حدیثیں خود رسول اللہؐ نیز خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی مرضی کے خلاف رواج پذیر ہوئیں' کیونکہ حضور اکرمؐ کی تاکید تھی کہ مجھ سے زیادہ روایتیں کرنے سے بچو اور خلفاء راشدین مسلسل کوشش کرتے رہے کہ اس کو یک قلم روک دیں۔

(۲) حدیثوں کی کتابت کا بھی یہی حال ہے۔ آنحضرتؐ نے تصریحاً ان کے لکھنے کی ممانعت فرمائی اور خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم برابر ان کے نوشتوں کو مٹاتے اور جلاتے اور امت کو فتنہ کتابت سے روکتے رہے۔

(۳) حدیثوں کی تصحیح وتضعیف بھی ظن وتخمین پر مبنی ہے کیونکہ ائمہ جرح وتعدیل کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا جس سے صحیح اور ضعیف روایات میں یقینی قائم کر سکتے اس لیے ان کی صحیح قرار دہ حدیثیں بھی ظنی رہیں۔ ان کے اصول کے مطابق کسی روایت کو صحیح کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''گمان غالب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا ہوگا۔'' نہ کہ قطعی یقین جیسا کہ ملا علی قاری نے اپنی کتاب موضوعات میں تصریح کی ہے:

''یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی' ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا

ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔''

پھر یہ صحیح قرار دی ہوئی حدیثیں بھی بالمعنی روایت کی گئی ہیں جس کی وجہ سے ان میں بے حد اختلافات ہیں۔ ان کو دین مان لینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ امت میں سینکڑوں فرقے بن گئے ہیں اور ملت کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ سنیوں کی حدیثیں الگ ہیں اور شیعوں کی الگ۔ ہر ایک فرقہ نے اپنے مذہب کی تعمیر اپنے حسب منشا روایات سے کی ہے وہ صرف اپنی ہی حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسروں کی حدیثوں کو غلط اور فرقہ بندی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ الآیہ

اور مشرکین میں سے نہ ہو یعنی ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفریق ڈال دی۔

بے شک آیات قرآن کے معانی سمجھنے میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ اختلافات چونکہ الفاظ و عبارت کے نہ ہوں گے بلکہ صرف فہم کے ہوں گے۔ اس لیے مزید غور و فکر سے مٹ جائیں گے اور ان سے فرقہ بندی نہ ہو سکے گی۔

الغرض حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے۔ اس سے تاریخی فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ نہیں پیش کی جا سکتی اس کو دین بنا لینے سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ قرآن کریم جو سراسر زندگی ہے حجاب میں آ گیا ہے چنانچہ محدثین میں شروع سے لے کر آج تک جو اہم اور معرکۃ الآرا امور زیر بحث رہے ہیں بالعموم اس قسم کے ہیں جن کا ملت کی صلاح و فلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی علمی تعلق نہیں ہے مثلاً حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں یا حضرت علیؓ؟ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سماء دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے؟ قیام نماز میں ہاتھوں کو باندھنا چاہیے یا نہیں؟ کیا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے؟ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ؟ وغیرہ وغیرہ۔

بخلاف اس کے اگر قرآن پر مدار رہتا تو اس نوعیت کے مسائل پیش نظر رہتے کہ مرکز کو قوی اور صالح العمل کیوں کر رکھا جائے؟ قرآنی ہدایت کو عام کرنے اور جملہ انسانی برادری کو اس نجات اور سعادت کے راستہ پر لانے کے کیا وسائل ہیں؟ کائنات فطرت جن کی نسبت قرآن نے کہا ہے کہ انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں ان کی مخفی قوتوں کو کن تدابیر سے قابو میں لا کر انسانی خدمت میں لگایا جا سکتا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کو کن ذرائع سے ایسا فروغ دیا جائے کہ ملت کا ہر ایک فرد صحیح ''خلیفہ فی الارض'' ہو سکے۔ جس کے لیے اس کی تکوین ہوئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

# حقیقتِ حدیث

قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم جس رسول امینؐ پر اترا۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے قرآن کریم جس روح الامین کے توسط سے اتارا گیا اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور قرآن کریم کو جس معبود نے اتارا اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے' بخلاف اس کے نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے' نہ اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے' نہ حدیث کے راوی پر ہمارا ایمان ہے' نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے' نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں ان پر ہمارا ایمان ہے' نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت مانیں۔

حدیث کی صورت یہ ہے کہ زید نے کہا میں نے سنا عمرو سے' اس نے سنا تھا بکر سے' اس سے بیان کیا تھا خالد نے' اس سے کہا تھا اصغر نے' اس نے سنا تھا اکبر سے الخ۔ ایسا بیان روایت' در روایت در روایت در روایت نہ علم ہے نہ شہادت اور نہ دنیا کی کسی عدالت کے نزدیک قابل سماعت ہے پھر یہ حجت کیسے ہوسکتا ہے؟ ہاں ایک بات حدیث میں ہے' وہ یہ کہ اس کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا جاتا ہے اور یہی چیز ہے' جس کی بدولت اس کی طرف توجہ کی جاتی ہے' لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں' لاکھوں حدیثیں راویوں نے اپنے اپنے خیالات اور اغراض کے ماتحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں وضع اور کذب سے کام لیا ہے تو اس نسبت کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ اگر یہ ہوتا کہ ہر ایک روایت کے آخری راوی سے ثبوت طلب کیا جاتا کہ تم نے جو فلاں سے اس کو سنا ہے اس

کے دو گواہ عادل پیش کرو۔ جو شہادت دیں کہ ہمارے سامنے اس نے یہ روایت کی اور پھر اسی طرح سلسلہ کے ہر ہر راوی کی سماعت کے دو دو گواہ آخر تک ہوتے تو بھی روایت کا کچھ اعتماد قائم ہوتا مگر یہاں تو نہ کوئی ثبوت ہے نہ شہادت ہے۔ ہر راوی جو کچھ بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے اور خود ہی گواہ ہے اور خود ہی ثبوت ہے۔[1] یعنی کسی بات کو آنحضرتؐ کی طرف بسلسلہ روایت در روایت منسوب کر دینا اسی کا نام حدیث ہے لہٰذا جملہ روایات کسی قسم کے ثبوت سے عاری ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جو رواۃ ہیں وہ معتبر ہیں لیکن یہ اعتبار کس بنیاد پر قائم ہوا ہے؟ صرف ان کے ہم عصروں کے بیانات پر یہ بیانات خود حجت نہیں' اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں باہم دگر سخت اختلافات ہیں اور ہزاروں ہیں' جن کو ایک اگر سچا سمجھتا ہے تو دوسرا جھوٹا۔ ائمہ نے رواۃ کی جو توثیق کی ہے وہ صرف عرف عام کے مطابق ہے نہ کہ حقیقت کے۔ ایسی ظنی اور تخمینی ثقاہت تاریخ میں تو کچھ کارآمد ہو سکتی ہے لیکن دین میں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا دارومدار علم و یقین پر ہے۔ قرآن میں تصریح ہے:

وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ. (بنی اسرائیل : ۳۶)

اس کے پیچھے نہ چل' جس کا تجھ کو یقین نہیں ہے۔

## حدیثیں دین کیونکر بنیں؟

قرآن کریم اسلام کی مستقل اور کامل کتاب ہے جس میں اللہ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے اور جس کی حفاظت ہمیشہ کے لیے اپنے ذمہ لی ہے۔ یہی کتاب عہد رسالت و خلافت راشدہ میں ملت اسلامیہ کا دستور العمل رہی لیکن جب بنی امیہ کا زمانہ آیا تو وہ حکومت الٰہیہ جو رسول اللہؐ نے قائم کی تھی' انسانی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ ان نام نہاد خلفاء نے (بجز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے) اپنا ذاتی تسلط ملت پر جمایا اور خزانہ اور ملک پر قبضہ کر کے فوج کو اپنے قابو میں کیا اور اس کی قوت سے آزاد مسلمانوں کو جو صرف اکیلے اللہ کے محکوم اور مطیع تھے اپنی رعایا اور غلام بنا لیا اور ان کی دینی قیادت اور راہنمائی جو خلیفہ اسلام کا اولین فریضہ تھی علماء کے ذمہ چھوڑ دی۔ اس وقت سے سیاست اور دین دو الگ الگ چیزیں ہو گئیں۔ سیاست کا سرکز تو یہی خلفاء رہے اور دین لاسرکزی صورت میں علماء کے ہاتھ میں آ گیا۔ ان

---

[1] اگر کوئی روایت متعدد طرق سے مروی ہے تو ہر ایک طریق بالکل ایسی طرح بے دلیل ہے اور ثبوت کا محتاج ہے۔

کے اجتہادات اور استنباطات میں اختلافات کا پڑنا لازمی تھا جن کے فیصلے کے لیے کوئی مرکز نہ تھا اس لیے رسول اللہؐ کی ذات مرکز بنائی گئی اور ہر مسئلہ اور ہر اجتہاد کے لیے روایت کا سلسلہ نکالا گیا۔ بنی امیہ کے عہد میں چونکہ سادہ عربی زندگی تھی اس وجہ سے روایات کا ذخیرہ زیادہ نہیں ہوا' لیکن بنی عباس کے زمانہ میں جب مختلف علوم وفنون کے ترجمے کئے گئے اور متعدد عجمی اقوام سے اختلاط ہوا' اور خیالات' افکار اور دینی مسائل میں بہت وسعت پیدا ہوگئی۔ اس وقت روایت نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے یہی پیشہ اختیار کر لیا اور چونکہ روایت کشی کے لیے کسی لیاقت یا معیار علم کی شرط نہیں تھی اس لیے ہر شخص جس میں ذرا بھی تدین ہوتا اس میں حصہ لے کر دینی عزت اور دنیاوی بزرگی حاصل کرنے لگا اور روایت ایک عام مشغلہ ہوگئی اور ہر شہر میں رواۃ کی تعداد کی کوئی حد نہ رہی۔

قرآن کو خلفاء بنی امیہ (بجز حضرت عمر بن عبدالعزیز) اور خلفائے بنی عباس نے جو دراصل متبد سلاطین تھے۔ سیاست سے پہلے ہی متروک کر دیا تھا' اب ان راویوں نے دینی حیثیت سے روایتوں کے اندر اس کو دفن کر دیا اور اس کی تشریح وتفسیر بھی انہیں سے ہونے لگی اور حدیث کا تسلط اس قدر بڑھ گیا کہ امام اوزاعی متوفی ۱۵۷ھ نے فرمایا کہ ''قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں'' اور امام یحییٰ بن کثیر نے کہا کہ ''حدیث قرآن پر قاضی ہے' قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے۔''[1] حدیثوں کے ذریعہ سے قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام' مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید' بلکہ اس پر اضافے کرنے لگے۔ نیز بعض ائمہ فقہ نے روایات سے آیات کو اصولاً منسوخ کرنے کا فتویٰ دے دیا اور اس طرح قرآن کے استقلال کو مٹا کر اس کو حدیثوں کے ماتحت بنا دیا۔ جن کی بدولت دین میں سینکڑوں باتیں ایسی داخل ہوگئیں' جن کا قرآن میں نام ونشان بھی نہیں ہے۔

## موضوعات:

حدیث نے جب فن کی صورت اختیار کر لی اور روایات دین قرار پا گئیں تو ان میں وضع اور کذب نے راہ پائی اور ہزاروں پیشہ ور کذاب پیدا ہوگئے جن کا دن رات یہی کام تھا کہ حدیثیں گھڑیں۔ ائمہ

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۲۲۔ مطبوعہ مصر۔

حدیث نے جب تنقید کی طرف توجہ کی تو ان کو موضوعات کا ایک انبار ملا۔ ملا علی قاری نے اپنی کتاب ''موضوعات کبیر'' میں لکھا ہے کہ ''زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں' شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب ''تذکرۃ الموضوعات'' میں لکھتے ہیں کہ جوبباری' ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار حدیثیں بنائیں۔ ابن ابی العوجاء زندیق کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب وہ پکڑا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتا رہا ہوں۔ وضاعین کی سب سے پہلی فہرست امام ابوعبداللہ برقی متوفی ۲۴۹ھ نے تیار کی۔ اس کے بعد دیگر ائمہ جرح وتعدیل نے اس میں کتابیں لکھیں جن میں سے چند یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| کتاب الضعفاء[1] | امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ |
| ایضاً | ابواسحٰق جوزجانی متوفی ۲۵۹ھ |
| ایضاً | ابوجعفر عقیلی متوفی ۳۲۳ھ |
| ایضاً | ابونعیم استرآبادی متوفی ۳۲۳ھ |
| ایضاً | ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ |

(یہ کتاب کامل کے نام سے مشہور ہے اور بارہ جلدوں میں ہے)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک تھی اور حدیثیں بھی جو آپؐ کے نام سے روایت کی گئی ہیں ان کا ۹۹ فیصدی حصہ مدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے' جس کی مدت دس سال ہے اور ادھر وضاعین کی اتنی بڑی جماعت ہوگئی جن کے تراجم بارہ بارہ جلدوں میں لکھے جانے لگے اور صدیوں کا زمانہ ان کو مل گیا جس میں ان کے اوپر نہ کوئی پابندی تھی نہ کسی قسم کی گرفت' بلکہ عوام میں مقبولیت شہرت عظمت اور بزرگی حاصل ہوتی تھی۔ پھر انہوں نے جس قدر حدیثیں وضع کی ہوں گی ان کو سوائے علام الغیوب کے کون شمار کرسکتا ہے۔

ائمہ حدیث نے وضع حدیث کے مختلف اغراض اور اسباب بھی بیان کیے ہیں مثلاً

(۱) بنی امیہ کے عہد میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر منبروں سے لعنت بھیجنے کا دستور نکالا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں امیر معاویہؓ کے مناقب اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مثالب میں حدیثیں

---

[1] ضعفاء کا لفظ ائمہ نے ازراہ احتیاط اختیار کیا ہے کہ شاید ان میں کوئی سچا نکل آئے ورنہ مراد کذابین ہیں۔

بنائی گئیں۔ اسی عہد میں روایتوں کے ذریعے سے ایمانیات میں ''تقدیر'' کا اضافہ کیا گیا۔
قرآن میں تو ایمان کے صرف پانچ اجزاء بتائے گئے ہیں:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ. (سورة بقره : ۱۷۷)

لیکن نیکی (کرنے والا) وہ ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخر پر اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور انبیاء پر۔

دوسری آیت میں ہے:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا. (سورة النساء : ۱۳۶)

اور جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخر کا انکار کیا وہ دور کی گم راہی میں پڑ گیا۔

لیکن اس میں چھٹا جزء ''اَلْقَدْرُ خَيْرُهٗ وَ شَرُّهٗ كُلُّهٗ مِنَ اللّٰهِ'' بھی بڑھایا گیا جو آج تک بدستور چلا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے تقدیر کو دین کی ایک حقیقت بتایا ہے اس کو ایمانیات میں نہیں داخل کیا ہے۔

(۲) ردعمل کے طور پر بنی عباس کے دعاۃ نے ہزاروں حدیثیں بنی امیہ کے معائب اور اقرباء رسول کے فضائل واستحقاق خلافت میں بنا کر مغرب سے مشرق تک پھیلا دیں۔

(۳) تخت خلافت پر آ جانے کے بعد عباسیوں نے اپنی حکومت کو دینی رنگ دینا چاہا اس وجہ سے ان کے ایک ایک خلیفہ کی پیشین گوئی اور فضیلت میں روایات بنائی گئیں۔ ابوالفرج اصفہانی' مطیع بن ایاس کے حالات میں لکھتا ہے کہ خلیفہ مہدی اس کا بڑا قدردان تھا کیونکہ وہ اس کی مہدویت کے بارے میں حدیثیں بیان کرتا تھا۔ [۱]

(۴) اہل بیت کے خلافت سے محروم ہو جانے کے بعد شیعہ ان کی امامت نیز ان میں سے ایک مہدی کے آنے کی بشارت کی روایتیں امت کو سناتے تھے اور اپنے ائمہ کی عصمت وعظمت

---

[۱] رنات الثالث والثانی فی روایات الآغانی جلد ۱ ص ۲۹۷۔

اوران کی محبت اور ولائیت کو جزو ایمان اور نجات کا ذریعہ ثابت کرنے کے لیے حدیثیں تراشتے تھے۔[1] اور یہ سب کچھ محض ان کی نسبی خصوصیت کی بنا پر تھا حالانکہ قرآن کی رو سے انسان کی قیمت کا معیار اس کے عقائد واعمال ہیں۔نسب کی بنیاد پر کسی کو کوئی حق وہ نہیں دیتا بلکہ اس کو صرف تعارف کا ذریعہ اور جیتے جی کا رشتہ بتلاتا ہے:

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَا اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ. (مومنون: ۱۰۱)

پھر جب صور پھونک دیا گیا تو نہ اس دن ان میں رشتے ہوں گے اور نہ آپس میں پوچھ گچھ کریں گے۔

اور قیامت کے دن مطلق کارآمد نہیں۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ ج یَوْمَ الْقِیَامَةِ. (سورة الممتحنة : ۳)

ہرگز تم کو نفع نہیں پہنچائیں گے تمہارے رشتے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن۔

(۵) قصاص، مذکر اور واعظ طرح طرح کے قصے افسانے اور روایتیں آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب کر کے اپنے قصص، اذکار اور مواعظ کو دل چسپ اور بااثر بناتے تھے۔

(۶) زندیقوں یعنی ان عجمیوں نے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر در پردہ اسلام کو مٹانے کی فکر میں تھے ایسی ایسی حدیثیں گھڑیں جو شریعت کو فنا کر دینے والی تھیں۔

(۷) مختلف فرقے جو اسلام میں پیدا ہو گئے تھے ان میں سے اکثر اپنی تائید اور اپنے مخالفوں کی تردید میں حدیثیں گھڑتے تھے۔

(۸) بعض لوگ جو متدین اور محترم سمجھے جاتے تھے اعمال واذکار کی ترغیب وترہیب میں روایتیں وضع کرتے تھے چنانچہ نوح بن مریم نے قرآن کے ایک ایک سورہ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔جب لوگوں نے تحقیق کی اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے بے تکلف اقرار کر لیا کہ یہ روایتیں میں نے بنائیں ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔

---

[1] شیعہ کے نزدیک ہر وہ بات جو ان کے کسی امام معصوم کی طرف منسوب ہو حدیث ہے اس لیے ان کے یہاں روایات میں بہت وسعت ہو گئی اور اسی نسبت سے موضوعات میں بھی۔

(۹) نبی اکرم ﷺ کی فضیلتیں اور بمقابلہ دیگر انبیاء کے جو خصوصیتیں ہیں ان کو قرآن نے مفصل بیان کر دیا ہے یعنی:

(۱) دیگر انبیاء قبائلی یا قومی ہوتے تھے مگر آپ جملہ بنی نوع انسان کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے۔

(۲) انبیاء سابقین کے اوپر جو کتابیں یا صحیفے نازل کئے گئے وہ سب فنا ہو گئے۔ آج توریت، زبور اور انجیل کے بھی صرف ترجمے ہیں اور اصل مرفوع، لیکن آپ کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی، اس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے اور ہمیشہ کے لیے اس کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

(۳) آپؐ کے اوپر نبوت ختم کر دی گئی اور قیامت تک کے لیے یہی نبوت قائم رکھی گئی۔

(۴) معراج میں انسانی کمال کی آخری حد اور علوم نبوت کے افق اعلیٰ پر پہنچا کر آپ کو اللہ نے جملہ انبیاء کی وراثت اور نبوت کبریٰ سے سرفراز فرمایا۔

ان کے علاوہ بھی جا بجا آیات میں آپ کے صفات اور فضائل کا ذکر ہے اور قرآن نے ان کے بیان کرنے میں کمی نہیں کی ہے، مگر باوجود ان کے رسول پرستی کے جذبہ میں آپ کے مدائح اور صفات میں ہزار ہا روایتیں گھڑی گئیں جن میں سے خود محدثین نے بیشتر کو موضوع قرار دیا۔

یہی حال معجزات کا ہے۔ قرآن نے تصریح کے ساتھ کہا کہ خاتم النبیین کو عقلی معجزہ قرآن کریم دیا گیا، جس کو اہل بصورت قیامت تک دیکھ سکتے ہیں، نہ کہ دیگر انبیاء کی طرح حسی معجزہ۔ [1]

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ط قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ط هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ. (سورۃ الاعراف : ۲۰۳)

اور جب تو ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لایا تو انہوں نے کہا کہ کیوں نہ تو نے کوئی نشانی چن لی۔ کہہ دے کہ میں تو اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کے یہاں سے وحی مجھ پر آتی ہے۔ یہی تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

---

[1] ان باتوں کی تفصیل ہماری کتاب تعلیمات قرآن میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہی بات دوسری جگہ میں مزید تصریح کے ساتھ ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ط (سورة العنكبوت: ۵۰. ۵۱)

اور کافروں نے کہا کہ کیوں نہ اس کے اوپر کوئی نشانی اتاری گئی کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں' میں تو کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔ کیا ان کے لیے کافی نہیں کہ ہم نے تیرے اوپر کتاب اتاری دی ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

یعنی جس نشانی یا معجزہ کے وہ طلب گار ہیں اگر ان کے پاس بصیرت ہو تو اس کے لیے قرآن کافی ہے:

آنحضرتؐ کی خواہش تھی کہ کوئی نشانی جیسی کہ یہ منکرین طلب کرتے ہیں مل جاتی تو میں ان کو قائل کر کے مسلمان بنالیتا۔ اس پر سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ کسی قدر عتاب کے ساتھ فرماتا ہے:

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ. (سورة الانعام : ۳۵)

اگر تیرے اوپر ان کی روگردانی گراں گزرتی ہے تو اگر تجھ سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سوراخ تلاش کر یا آسمان پر سیڑھی لگا اور ان کے لیے نشانی لا۔ اللہ اگر چاہتا تو سب کو سیدھے راستہ پر لگا دیتا' تو جاہلوں میں سے نہ بن۔

اور سورۂ بنی اسرائیل میں حسی معجزات نہ دینے کی وجہ بیان کر دی۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ. (سورة بنی اسرائیل : ۵۹)

ہم کو نشانیاں بھیجنے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ پہلے لوگ ان کو جھٹلا چکے ہیں۔

گزشتہ قوموں نے معجزات طلب کئے پھر ان کو دیکھ لینے کے بعد جادو اور نظر بندی وغیرہ کہہ کر

جھٹلایا۔ اس لیے اتمام حجت کے بعد ان کا ہلاک کرنا لازم آ گیا' لیکن رحمۃ للعلمین کا دور عقل و بصیرت کا دور ہے جس میں انسان کو خود حقیقت کو سمجھ کر ایمان لانا چاہیے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ (سورۃ الکھف: ۲۹)

اور کہہ دے کہ حق تمارے رب کی طرف سے آ چکا جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر بنے۔

مگر ان صریح آیات کے ہوتے ہوئے بھی راویوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسی معجزات کی روایات کا انبار لگا دیا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے امت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ اولیاء کی کرامات پر بھی ایمان رکھو۔

(۱۰) مناقب صحابہ میں جس قدر روایتیں ہیں ان میں سے اکثر کو محدثوں نے موضوعات کی فہرست میں داخل کیا ہے۔

دراصل صحابہ کرام کی فضیلت کے لیے وہی آیتیں دینی لحاظ سے کافی ہیں جو مہاجرین و انصار کی مدح میں قرآن میں ہیں اور تاریخی لحاظ سے ان کے کارنامے ان کی عظمت کے شاہد ہیں۔ ان کی برتری اور بزرگی کے لیے روایات کی ضرورت ہی نہیں۔

(۱۱) علماء اور متعلمین کے فضائل میں جس قدر روایتیں ہیں' خود ساختہ ہیں۔

(۱۲) شخصیت پرستی آ جانے کی وجہ سے اشخاص نیز مقامات کی فضیلتوں میں حدیثیں وضع کی گئیں۔

(۱۳) تصوف جب مسلمانوں میں آیا تو بہت سی متصوفانہ روایتیں بنائی گئیں[1] جو موضوعات جمع کرنے والے محدثوں کے حصہ میں آئیں۔

(۱۴) آنحضرتؐ کے غزوات' پیش گوئیوں نیز آیات کی تفسیر میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں حدیثیں

---

[1] ان روایات کے مطالعہ کا جس کو شوق ہو وہ مولانا کرامت علی موسوی دہلوی کی کتابیں ''السیرۃ المحمدیہ'' دیکھے جس میں عجیب و غریب ہزارہا معجزات جمع کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ مدت ہوئی بمبئی میں بڑی تقطیع پر باریک خط میں ساڑھے چھ سو صفحات پر طبع ہوئی تھی۔

روایت کی گئیں، جن کی نسبت امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ان کی کوئی اصلیت نہیں۔[1]

الغرض وضع اور کذب کے بہت سے اسباب تھے اور بہت سی راہیں۔ ہر ہر شعبہ میں بے شمار روایتیں گھڑی گئیں اور ایک ایک سچ میں سو سو جھوٹ ملایا گیا۔ لاریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اقوال کے متعلق کچھ صحیح حدیثیں بھی ضرور تھیں لیکن اس جھوٹ کے سیلاب سے جو مختلف راستوں سے آیا سچائی کے ان قطروں کو یقین کے ساتھ چن لینا' انسانوں کے لیے بالکل ناممکن ہو گیا۔

کیا کذب اور وضع سے بڑھ کر دین الٰہی کو مذاق بنانے کی اور کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ قرآن میں ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ق وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا (سورة القمان : ٦)

اور بعض لوگ وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ بلا یقین کے اللہ کی راہ سے لوگوں کو گمراہ کریں اور اس (اللہ کی راہ) کو مذاق بنالیں۔

## دو قسم کے شیاطین:

ہر نبی کی عداوت کے لیے دو قسم کے شیاطین (کذابین) ہوتے ہیں جن کی تفصیل قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے۔

۱۔ پہلی قسم وہ ہے جو نبی کے اوپر اتری ہوئی آیات میں اضافے کر کے ان کو مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان اضافوں سے اپنی آیات کو محفوظ کر کے محکم کر دینے کا ذمہ اللہ نے خود لیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْ اُمْنِيَّتِهٖ ج فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ط. (سورۂ حج:۵۲)

ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ جس وقت اس نے تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں (اپنے الفاظ) ڈال دیئے۔ پھر اللہ شیطان کی ڈالی ہوئی

---

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۲۔

باتوں کو نکال کر اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

اس لیے ''تلک الغرانیق'' اور اسی قسم کی قرأت شاذہ کی روایتیں جن سے اللہ نے اپنی آیات کو پاک کر کے محکم کر دیا ہے' ناقابل قبول بلکہ ناقابل سماعت ہیں۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جو دین میں جھوٹی روایتیں گھڑتی ہے اور افترا کرتے ہوئے نہ عاقبت سے ڈرتی ہے نہ اللہ سے شرماتی ہے۔

مفتریوں کی سزا نامرادی ہے ''وقد خاب من افتری'' یہودیوں نے جھوٹی روایتیں گھڑی تھیں۔ اللہ نے ان کے بارے میں فرمایا:

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (آل عمران : ۲۴)

اور دین میں ان کو دھوکا دیا ان باتوں نے جن کو وہ گھڑتے تھے۔

محدثین کی اس جماعت کو چھوڑ کر جنہوں نے سچائی کی جستجو کی' وضاعین اور کذابین ان آیات کے تحت میں آتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○ وَلِتَصْغٰى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُقْتَرِفُوْنَ ○ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ○ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ج وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○ (انعام ۱۱۳ تا ۱۱۷)

اور ایسا ہی ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے انسی اور جنی شیاطین جو ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی فریب دینے والی باتیں سکھاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے' سو تو ان کو اور ان کی گھڑی ہوئی باتوں کو چھوڑ دے اور وہ اس لیے (کرتے ہیں) تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اس کو پسند کریں اور وہی کریں جو وہ کر رہے ہیں۔ (تو یہی کہتا رہ) کہ کیا اللہ کے سوا میں اور کسی کو منصف مانوں'

حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتار دی ہے اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتری ہے۔ لہذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور تیرے رب کی باتیں سچائی اور عدل کی رو سے پوری ہیں' کوئی اس کے الفاظ کو بدلنے والا نہیں ہے' وہ سمیع وعلیم ہے اور اگر تو بات مانے گا اکثر لوگوں کی جو دنیا میں ہیں تو وہ اللہ کی راہ سے تجھ کو بھٹکا دیں گے' وہ تو صرف گمان پر چلتے ہیں اور محض اٹکل دوڑاتے ہیں۔

ان آیات کی تشریح کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے مگر چند باتیں بالکل واضح ہیں:

۱۔ ہر نبی کے دین میں وضاعین اور کذابین روایتیں گھڑتے اور پھیلاتے ہیں۔

۲۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ ان ہی جیسے عقبیٰ سے بے خوف لوگ ان کی باتیں مانیں اور وہی کرنے لگیں جو وہ کر رہے ہیں۔

۳۔ مومن کو حکم ہے کہ ان کو اور ان کی گھڑی ہوئی روایتوں کو بھی چھوڑ دے اور یہی کہے کہ اللہ کے سوا میں کسی کو حکم نہیں مانتا۔ اس نے مفصل کتاب اتار دی ہے (جو کافی ہے)

۴۔ اللہ کی اطاعت کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت میں گمراہی کا ڈر ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ ظنی اور تخمینی باتوں کو دین بنائے ہوئے ہیں۔

یہ اللہ کی اطاعت رسول اور اس کے بعد اس کے خلفاء کے ذریعہ سے ہوگی' جو امت کو قرآن کے مطابق چلائیں گے۔ یہ نہیں کہ ظنی روایات کے انبار میں سے ہر ہر فرقہ اپنے اپنے خیال کے مطابق حدیثیں چن چن کر ان پر عمل کرے اور رسولؐ کی اطاعت کا دم بھرے۔

## رفتار حدیث:

عہد صحابہؓ میں حدیثیں بہت کم تھیں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم روایت اور کتابت حدیث دونوں سے منع فرماتے تھے' اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا' حدیثیں بڑھتی گئیں اور چونکہ ان میں وضع اور کذب نے راہ پائی تھی' اس وجہ سے ارباب بصیرت اور اہل تقویٰ ان کے قبول کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔

## امام اعظمؒ:

ائمہ فقہ میں سب سے پہلے امام جن کی امامت آج تک مسلم چلی آتی ہے امام ابوحنیفہؒ متوفی ۱۵۰ھ ہیں انہوں نے حدیثوں کی قبولیت کے لیے بہت سخت شرطیں رکھی تھیں۔ من جملہ ان کے ایک یہ بھی تھی کہ راوی فقیہہ ہو تاکہ روایت کا موقع، محل، غرض اور مفہوم سمجھنے میں غلطی نہ کرے اس وجہ سے وہ اخبار احاد میں سے ایسی روایتوں کو بھی جو قیاس صحیح کے خلاف معلوم ہوتیں، قبول نہیں کرتے تھے، مثلاً قرعہ اندازی کو وہ اصولاً قمار بازی خیال کرتے تھے پھر اس حدیث کو کیسے صحیح تسلیم کر لیتے کہ "آنحضرتؐ جب کسی سفر میں جاتے تو ازواج مطہراتؓ میں قرعہ ڈالتے، جس کا نام نکلتا اس کو ساتھ لے جاتے۔" اسی طرح ان کے نزدیک مال غنیمت میں سوار کا حصہ پیادہ سے دگنا تھا۔ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "گھوڑے کے دو حصے ہیں اور سپاہی کا ایک" یعنی سوار کے تین حصے ہیں۔ جواب دیا "میں ایک چوپایہ کا حصہ ایک مومن سے ہرگز زیادہ نہیں سمجھتا۔" ان کا قول تھا کہ بیع جب پختہ ہو چکی تو فسخ کا اختیار بائع یا مشتری میں سے کسی ایک کو باقی نہیں رہا۔ کسی نے کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک بائع اور مشتری ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں، فسخ بیع کا اختیار باقی ہے۔ کہنے لگے کہ خواہ وہ دونوں ایک ہی جہاز میں ہوں یا ایک ہی قید خانہ میں ہوں یا ایک ہی ساتھ سفر کر رہے ہوں؟ یعنی ایسی صورت میں مفارقت تو ہو گی نہیں، پھر بیع بھی پختہ نہ ہو سکے گی۔ وہ قصاص میں (غالباً مثلہ کے قیاس پر) غیر فطری اور بے رحمی کے طریقہ کو جائز نہیں رکھتے تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر دو پتھروں میں کچل دیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کا سر بھی دو پتھروں میں کچلوا دیا۔ بولے کہ یہ ہذیان ہے۔ ایک بار ایک شخص نے سوال کیا، انہوں نے جواب دے دیا۔ اس نے کہا کہ آنحضرت ﷺ سے فلاں روایت اس کے خلاف ہے، کہا کہ ہم کو ایسی روایتوں سے معاف رکھو۔ ابواسحاق فزاری نے ان کے سامنے ایک حدیث بیان کی، بولے کہ یہ حدیث خرافہ ہے۔ لوگوں نے اس طرح کے کم و بیش دو سو فتاوے ان کے حدیث کے خلاف گنائے ہیں، اسی وجہ سے ارباب روایت ان سے خفا ہیں۔ چنانچہ امام بخاری نے بعض الناس کہہ کر ان کو ضعفا میں شمار کیا ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہا کہ ہم نے اللہ کے مقابلہ میں ابوحنیفہ سے زیادہ جرأت کرنے والا نہیں دیکھا، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، وہ دراصل ان روایات کی نسبت کو رسول اللہؐ کی طرف صحیح نہیں سمجھتے تھے اور انہوں نے جو دقیق شرطیں حدیث کی صحت

کے لیے رکھی تھیں ان کے مطابق وہ نہیں اترتی تھیں۔ امام شافعیؒ نے ''کتاب الأم'' میں ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''جو روایت قرآن کے خلاف پڑتی ہو وہ رسول کا فرمان ہو ہی نہیں سکتی'' لہذا قرآن اور سنت (اسوۂ رسولؐ) کو معیار سمجھ کر انہیں پر روایتوں کو جانچا کرو۔'' مکی نے بھی ''مناقب ابوحنیفہ'' ص ۹۹ میں ان کا قول نقل کیا ہے کہ ''روایات کا رد نبی اکرمؐ کی تکذیب نہیں ہے بلکہ اس کی تکذیب ہے جو غلط بات کو آنحضرتؐ کی طرف منسوب کرتا ہے' ورنہ آپ کا فرمان سر اور آنکھوں پر۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہ بھی ہمارا ایمان ہے کہ آپؐ نے کوئی حکم ایسا نہیں دیا جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو اور نہ کوئی بدعت یعنی نئی بات اپنی طرف سے کہی۔'' [1]

## موطا:

امام اعظمؒ کے بعد ہی امام مالک کا زمانہ ہے بلکہ ان دونوں اماموں کو ہمعصر سمجھنا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں وفات پا گئے اور امام مالکؒ کی پیدائش ۹۳ھ میں اور وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔ ان کی کتاب موطا خیر القرون کے عمل متواتر کا جملہ دینی کتابوں سے زیادہ اعتماد کے قابل مجموعہ ہے۔ کیونکہ مدینہ منورہ عہد رسالت اور خلاف راشدہ میں اسلام کا مرکز رہا۔ اس میں علماء تاریخ کے اندازہ کے مطابق کم وبیش بارہ ہزار صحابہ تھے' جن میں سے تقریباً دس ہزار وہیں رہے اور وہیں فوت ہوئے۔ بقیہ دو ہزار دیار و امصار یعنی عراق و مصر و شام و یمن وغیرہ میں پھیلے' اس لیے شریعت کا اصلی اور صحیح ذخیرہ مدینہ ہی میں وہ سکتا تھا۔ یہ خوبی اتفاق ہے کہ آج ہمارے ہاتھوں میں جس قدر دینی کتابیں ہیں۔ ان میں سب سے پہلی کتاب جو مدوّن ہوئی وہ مدینہ میں ہوئی' یعنی یہی موطا۔ اس کتاب میں اہل مدینہ کے پاس اسوۂ رسولؐ و خلفاء راشدین و صحابہ کرام و تابعین عظام کا جو کچھ سرمایہ تھا اور جس قدر مسائل اور فتاوے ان کے معمول بہ تھے۔ وہ سب جمع کر دیئے گئے ہیں۔

شارحین کے بیان کے مطابق امام موصوف نے اپنی وفات سے چالیس سال پہلے اس کو مرتب کیا تھا۔ ان کی وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔ اس وجہ سے اس کی تالیف کا زمانہ ۱۴۰ھ سمجھنا چاہیے یہ کتاب چالیس

---

[1] ضحی الاسلام جلد ۲۔ صفحہ ۱۹۳۔۱۹۵۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام اعظم کی مثال کو میں نے عدم حجیت حدیث کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ غالباً وہ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق حجت مانتے تھے۔ میرا استدلال تو قرآن کریم سے ہے۔

سال تک ان کے ہاتھوں میں رہی اور اسی کا درس وہ اپنے شاگردوں کو دیتے رہے۔ اس کی شرح زرقانی کے مقدمہ میں ہے کہ جب امام موصوف نے اس کو مدون کیا تھا اس وقت اس میں چار ہزار حدیثیں تھیں۔ لیکن وہ سال بسال کانٹ چھانٹ کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے انتقال کے وقت اس میں صرف ایک ہزار روایتیں رہ گئیں۔ اس تعداد میں مراسیل بھی شامل ہیں۔ متصل السند حدیثیں اس کے مختلف نسخوں میں صرف تین سو سے پانچ سو تک ہیں۔ معلوم نہیں کہ امام موصوف اور زندہ رہتے تو اس تعداد میں بھی کس قدر کمی ہو جاتی کیونکہ حدیثوں کو وہ ظنی ہی سمجھتے تھے اور ان کے متعلق یہ آیت پڑھا کرتے تھے: [1]

اِنَّ نَظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ط . (احقاف : ۳۲)

ہم تو صرف گمان رکھتے ہیں، ہم کو یقین حاصل نہیں ہے۔

یہ ہے وہ کل ذخیرہ حدیث وفقہ کا جو مرکز اسلام مدینہ منورہ کا سرمایہ ہے یہ امت کے اسلاف کرام کا ترکہ ہے جو امام مالکؒ کی وساطت سے اس کو وراثت سے ملا ہے۔ بے شک امام ابن حزم کے قول کے مطابق ''اس میں بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں۔'' مثلاً رجم زانی کی روایت نیز اس کے بعض فقہی مسائل میں بھی اختلاف کی گنجائش ہے۔ لیکن قرآن سے سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

## قانون عام:

خلفاء بنی امیہ کے زمانہ میں چونکہ زندگی سادہ تھی اور مسائل شرعیہ میں علمی موشگافیاں نہیں ہوتی تھیں، اس وجہ سے سلطنت کے لیے عام قانون کی ضرورت کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی، مگر خلفاء عباسہ نے اپنے تسلط پر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کی اس لیے ان کی خواہش یہ ہوئی کہ ایک مرکزی قانون بنا لیا جائے جس پر سب لوگ چلیں۔ ابن المقفع نے خلیفہ منصور کے سامنے حکم رانی کے متعلق جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں بھی اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا کہ اجماعی اور متفق علیہ نصوص کے مطابق ایک ایسا قانون بنا دیا جائے جس سے سب لوگ واقف ہوں۔ پھر زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم واصلاح ہوتی رہے چنانچہ منصور نے امام مالک سے درخواست کی

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۱۳۔

کہ موطا کو سلطنت کا قانون عام قرار دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ مختلف حصوں میں لوگوں کا عمل مختلف طریقوں پر رائج ہو چکا ہے منصور نے کہا کیا مضائقہ ہے ہم بزور ان کو اس کے اوپر چلائیں گے مگر وہ راضی نہ ہوئے۔

شیخ محمد عبدہ مرحوم مفتی دیار مصریہ کے خیال میں امام مالک کے انکار کی وجہ یہ تھی کہ خبر احاد حجت نہیں ہے، جس کی رو سے کوئی بات کسی پر لازم کی جائے' وہ لکھتے ہیں:[1]

**اِنَّمَا یُحِبُّ الْعَمَلَ باحادیث الاحادعلٰی من وثق بھاولکن لا یجعل تشریعا عامًا.**

اخبار احاد پر عمل اس کے لیے واجب ہے جو ان پر وثوق رکھتا ہو وہ قانون عام نہیں بنائی جا سکتیں۔

اس ذیل میں صحیح بخاری کا ذکر بھی مناسب ہے جو علم حدیث کے انتہائی عروج کے زمانہ میں لکھی گئی۔

## صحیح بخاری:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ کی مدون کی ہوئی ہے یہ امام مالک کی موطا کے ایک صدی کے بعد لکھی گئی' جب کہ علم حدیث اپنے معراج پر پہنچ چکا تھا اور امام بخاری کے اساتذہ میں سے امام احمد بن حنبل دس لاکھ اور امام یحیٰی بن معین بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے۔ مقدمہ صحیح بخاری میں ہے کہ امام بخاری نے جب یہ کتاب لکھنی شروع کی تو چھے لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے پاس تھیں' ۷۲۷۵ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق پایا جن کو درج کیا۔ ان میں مکررات بھی شامل ہیں اگر وہ نکال دی جائیں تو حافظ ابن حجر شارح بخاری کے بیان کے مطابق تعلیقات وغیرہ کو چھوڑ کر موصول السند احادیث کی تعداد ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔

یہ خالص حدیث کی کتاب ہے اور اس میں فقہ صرف اسی قدر ہے کہ اس کے ابواب کی ترتیب فقہی ہے۔ حدیث میں یہ سب سے چوٹی کتاب ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کی گئی ہے۔ اور اس کی

---

[1] تفسیر القرآن جلد ۱ ص ۱۳۸

جملہ روایات صحیح مانی گئی ہے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ امام بخاری نے جن حدیثوں کو چھوڑ دیا' وہ سب کی سب ضعیف یا غلط نہ تھیں مگر جن کو انہوں نے چھوڑ دیا ان کے متعلق بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم کو تو ان روایتوں کو دیکھنا ہے جو انہوں نے لی ہیں کیا وہ سب کی سب صحیح ہیں؟

اس میں کچھ شک نہیں کہ امام بخاری حدیث کے بلند پایہ امام تھے اور صحیح روایتوں کو لینے کے لیے جن لوازم اور شرائط کی فن رجال کی رو سے ضرورت تھی' انہوں نے سب کا لحاظ رکھا مگر باوجود ان سب کے چونکہ محدثین کا مدار صرف اسناد کی صحت پر رہ گیا تھا اس لیے اس کتاب میں ایسی حدیثیں بھی آ گئیں جو روایت کی رو سے صحت کے معیار پر نہیں اترتیں۔ مثلاً اس کے صرف ایک باب کتاب الانبیاء کو لے لیجئے اس میں ہے کہ:

۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس امید میں کہ ان کی ہر ہر بیوی ایک ایک مجاہد فرزند جنے گی' ایک رات میں اپنی نوے بیویوں پر گشت لگایا۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کو جب وہ ان کی جان نکالنے آیا ایسا تھپڑ مارا کہ واپس لوٹ گیا۔

۳۔ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ساٹھ گز کا پیدا کیا۔

یہ اور اسی قسم کی بعض دیگر روایتیں جو اس میں ملتی ہیں اگر ان کو درایتاً دیکھا جائے اور عقل اور قرآن کی کسوٹی پر کسا جائے تو صحیح نہیں ثابت ہوتیں پہلی روایت نہ صرف عقلی بلکہ انسانی فطرت کے لحاظ سے ناممکن ہے۔

دوسری روایت قرآن سے معارض ہے جس نے عالم ملکوت کے ان محافظوں کو جو انسانوں پر معین کیے جاتے ہیں ملک الموت کہا ہے سورۂ انعام میں ہے:

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا. (آیہ ۶۱)

اور تمہارے اوپر محافظوں کو بھیج دیتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں کسی کی موت آتی ہے تو (وہی) ہمارے فرستادے اس کی جان نکال لیتے ہیں۔

سورۂ سجدہ میں ہے:

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ. (آیت ۱۱)

کہہ دے کہ موت کا وہ فرشتہ تمہاری جان نکالتا ہے جو تمہارے اوپر مقرر ہے۔

یہ غیر مادی موکل نہ تھپڑ مارے جا سکتے ہیں نہ تھپڑ کھا کر واپس لوٹنے والے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان جلالی کو اس انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے جیسے کوئی عامل کسی رئیس کے پاس وصولی کے لیے کسی پیادہ کو بھیجے اور وہ اپنے زعم ریاست میں تھپڑ مار کر اس کو بھگا دے حالانکہ انبیاء کرام کا شیوہ رضائے برضا الٰہی ہے۔

تیسری روایت صحیح تاریخ کے خلاف ہے چنانچہ خود صحیح بخاری کے بہترین شارح حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ''اقوام کے آثار سے جہاں تک پتا لگ سکا ہے' انسان کا قد اتنا بڑا ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے اب تک اس کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آ سکی ہے۔''[1]

ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے' امام بخاری نے اپنے شروط کی مراعات میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہوگی' کیونکہ وہ جرح و تعدیل کے مسلم اور مستند امام ہیں' لیکن ان اسرائیلیات کے ان کی کتاب میں درج ہو جانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔

۱۔ وضاعین اپنی روایتوں پر ثقہ راویوں کے نام چسپاں کر دیتے تھے اور یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا امام بھی اس قسم کی جملہ تدلیسوں سے باخبر تھا۔

۲۔ خود فن رجال ظنی ہے' اس لیے اس کے اصول کی مراعات سے بھی روایات کی صحت کی ضمانت نہیں ہو سکتی' جس کے چند وجوہ یہ ہیں۔

۱۔ اس فن میں رجال کے صدق و کذب کا مدار ان کے ہم عصروں کی شہادتوں پر رکھا گیا ہے' حالانکہ یہ ایسی باطنی صفتیں ہیں جن کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔

۲۔ یہ ہم عصروں کی شہادتیں بھی ہم خیالی استادی' شاگردی' اور دیگر عواطف و میلانات پر مبنی ہیں چنانچہ سنی شیعہ راویوں کو اور شیعہ سنی راویوں کو من حیث الجماعت غیر معتبر سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے سے روایت نہیں لیتے۔

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۲۶۰۔

۳۔ اس فن کی رو سے جو صادق قرار پایا گیا اس کی ہر روایت سچی اور جو کاذب قرار پایا گیا اس کی ہر روایت جھوٹی سمجھی جاتی ہے اور یہ واقعیت کے خلاف ہے کیونکہ یہ کیا ضرور ہے کہ جس کو آپ سچا کہہ دیں وہ ہمیشہ سچ بولے اور جس کو جھوٹا کہہ دیں اس کی ہر بات جھوٹی ہو اس لیے یہ فن حقیقت سے بعید ہو گیا۔ ملا علی قاری کا یہ قول ہے کہ:

''یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی ہے ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں' کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔''[1]

دراصل فن رجال پر صحیح تنقید ہے اور انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ نہ صرف روایات بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنی ہے۔

ان ظنیات کو دینی حجت ماننے کی کوئی دلیل اس کے سوا نہیں ہے کہ

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ. (زخرف: ۲۲)

ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک راہ پر پایا اور ہم بھی انہیں کے نقوش قدم پر سینہ سے لگے ہوئے ہیں۔

## اختلافات:

چونکہ جرح و تعدیل ظنی ہے اور روایات کی تصحیح اسی کی بنیاد پر کی گئی ہے' اس وجہ سے محدثین کی صحیح قرار دی ہوئی حدیثوں میں بھی بے حد اختلافات ہیں' جن سے مختلف فرقہ اور خیال کے لوگ اپنے اپنے حسب منشاء استدلال کرتے ہیں۔ ان میں باہم مطابقت پیدا کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں اس قدر تکلف ہے کہ مخالفوں سے تسلیم کرانا مشکل ہے اور بعض بعض تو اس قدر متضاد ہیں کہ ان میں تطبیق ہو ہی نہیں سکتی' اور چونکہ فقہ کا مدار آیات سے زیادہ روایات پر ہے اس وجہ سے اس میں بھی اس کے آثار نمایاں ہیں اور مسائل میں بے حد اختلافات ہو گئے ہیں۔

روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ایک ہی مقام میں

---

[1] موضوعات کبیر ص ۱۶۔

مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہاء حج کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابوحنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہوگی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن لیلیٰ سے جا کر یہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابن شبرمہ سے جا کر دریافت کیا' بولے کہ بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہاء ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں رایوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سب یہ سب باتیں کہیں فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں' مجھے تو حدیث ملی ہے:

**حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع و شروطٍ.**

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔

یہ سن کر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ:

**حدثنی هشام بن عروه عن ابیه عن عائشةؓ قالت امرنی رسول الله ان اشتری بریرة فاعتقها فاشترط اهلها الولاء لانفسهم فقال رسول الله ماکان من شرطٍ لیس فی کتاب الله فهو باطلٌ.**

یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ ولاء ان کی رہے گی۔ رسولؐ نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے' وہ باطل ہے۔

اب ابن شبرمہ کے پاس آیا' انہوں نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا کہ

**حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن وثار عن جابر قال بعت النبی بعیرًا و شرط لی حملانه الی المدینه**

یعنی میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری یہ شرط منظور کی گئی

کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔

مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف ہی پر نہیں ہے' بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔

## خاتمہ:

ان تمام بیانات کو جو حقائق پر مبنی ہیں' دیکھنے کے بعد ہر سوچنے اور سمجھنے والا شخص مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچ سکتا ہے:

۱۔ قرآن دین کی مستقل کتاب ہے اور اجتماعی اور انفرادی ہر لحاظ سے ہدایت کے لیے کافی ہے۔ وہ انسانی عقل کے سامنے ہر شعبہ حیات میں اتنی روشنی رکھ دیتا ہے کہ وہ اس کے نور میں اللہ کی مرضی کے مطابق کام کر سکے۔

۲۔ اس کی عملی تشکیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرما دی ہے جو امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہے اور اس میں تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔

۳۔ عمل بالقرآن کا زمانہ عہد رسالت و خلافت راشدہ تک ہے جس کے بعد مستبد سلاطین کے تسلط سے دینی لامرکزیت اور انفرادیت آ گئی۔ اس عہد کی کوئی بات خواہ حدیث ہو خواہ فقہ' دینی حجت نہیں ہے۔ ہاں قرآن یا اسوۂ حسنہ کے مطابق ہونے پر قبول کی جائے گی۔ حدیث کا صحیح مقام ''دینی تاریخ'' ہے اور فقہ کا ''ہنگامی اجماع یا قیاس۔''

# علم فقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد تیرہ سال مکہ میں گزارے۔ پھر ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور دس سال وہاں رہے۔ مکہ میں توحید کی دعوت' مکارم اخلاق کی تعلیم' شرک و کفر کی تردید اور اثبات معاد وغیرہ کی آیتیں نازل ہوتی رہیں۔ شرعی مسائل نہیں تلقین کیے گئے۔ بعض امور مثلاً نماز زکوۃ وغیرہ کے احکام بھی اترے تو ان کی اس قدر تفصیل نہیں کی گئی' جس قدر مدینہ میں آ کر ہوئی۔ وجہ ظاہر ہے کہ قوانین کی احتیاج اس وقت ہوتی ہے' جب جماعت بن جائے' مدینہ میں آ کر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی شروع ہوئی' اس لیے ضوابط کی ضرورت پڑی' جن کی اصولی تعلیم قرآن میں دی گئی۔

یہ قانونی یا فقہا کی زبان میں احکامی آیتیں زیادہ نہیں ہیں۔ قرآن کی کم وبیش چھے ہزار آیتوں میں سے صرف دوسو آیتیں تشریعی ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ تعداد بڑھا کر پانچ سو تک پہنچا دی ہے۔ مگر یہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بہت سی آیات کو احکامی قرار دینے میں غلو سے کام لیا ہے۔

اکثر یہ آیتیں ضرورت پیش آنے پر اترتی تھیں۔ رسول اللہؐ ان کی رو سے احکام دیتے یا فیصلے کرتے تھے۔ بعض آیات میں جزی احکام بھی ہیں مگر زیادہ تر ایسی ہیں جو اصول کا حکم رکھتی ہیں جن کی تفصیل یا تشکیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول یا عمل سے کرتے تھے۔ مثلاً نماز کا حکم قرآن میں ہے' لیکن اس کی عملی شکل رکعتوں کی تعداد اور اوقات کی تعیین وغیرہ رسول اللہؐ نے فرمائی۔ اسی طرح زکوۃ کا حکم مطلق ہے۔ اس کا نصاب' اس کی مقدار اور ادائیگی کی مدت حضورؐ نے تعیین کی۔ یہی صورت روزہ' حج' نکاح' طلاق وغیرہ کے احکام کی ہے۔ اس طرح پر امت کے پاس شریعت کے لیے دو چیزیں ہو گئیں۔

احکامی آیات اور رسول اللہؐ کے استنباطات جن کو فقہ میں کتاب وسنت کہتے ہیں۔[1]

ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی میں ہر قسم کی ضروریات نہ پیش آسکتی تھیں۔ نہ ان کے لیے احکام دیئے جاسکتے تھے' اس لیے کتاب وسنت کو اصل قرار دے کر آئندہ کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا گیا کہ اگر ان دونوں میں کسی پیش آنے والی ضرورت کے بارے میں حکم نہ ملے تو خلیفہ یا امیر کو اہل علم کے مشورہ سے غور وفکر کے بعد نظائر پر قیاس کر کے اپنی عقل سے حکم نکالنا چاہیے اس لیے تشریع میں تیسری چیز قیاس یا رائے ہوئی۔ اجماع اکثریت کے اتفاق آراء کا نام ہے۔ وہ رائے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔

## فقہ صحابہ:

رائے کا استعمال نہ صرف ضرورتاً بلکہ عقلاً ناگزیر ہے کیونکہ قرآن کا خطاب انسانی عقل ہی سے ہے چنانچہ آنحضرتؐ کے بعد ہی صحابہ کرامؓ کے سامنے خلافت کا اہم مسئلہ پیش آیا جس کے بارے میں نہ کوئی تصریح کتاب میں تھی نہ سنت میں۔ اس وقت انہوں نے رائے سے کام لیا اور معاملہ کو اپنی عقل سے سلجھایا۔ سقیفہ بنی ساعدہ ان کے استعمال رائے کا سب سے پہلا مظہر تھا۔ اس کے بعد مرتدین عرب سے جہاد کا فیصلہ بھی رائے ہی سے کیا۔ پھر مہاجرین وانصار کے وظائف کا معاملہ پیش ہوا۔ اس میں بھی اختلاف رائے تھا۔ صدیق اکبرؓ مساوات چاہتے تھے اور حضرت عمرؓ کہتے تھے کہ جن لوگوں نے نبیؐ اور اسلام کی خاطر گھر بار چھوڑا ان کو زیادہ ملنا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا کہ ان کا یہ عمل اللہ کے لیے تھا جس کا اجر آخرت میں ملے گا۔ دنیاوی گزارہ میں امتیاز قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے چنانچہ انہوں نے سب کا وظیفہ مساوی رکھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں طبقات کے لحاظ سے تقسیم کی۔ پھر حضرت علیؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد اس تفریق کو مٹا دیا۔

خلفاء راشدین میں سے حضرت عمرؓ کے تفقہ میں رائے کا استعمال بہت نمایاں ہے۔ وہ غیر مصرح

---

[1] یہاں سنت سے آنحضرتؐ کا ہر قول وفعل مراد نہیں بلکہ وہ اقوال واعمال مراد ہیں جن کی اصولی تعلیم قرآن میں ہے اور ان کی تفصیل یا تشکیل حضورؐ نے فرمائی ہے۔ یہ سنت امت میں عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے جو یقینی اور دینی ہے لیکن اس کے متعلق جو روایات ہیں' وہ تمام تر ظنی ہیں۔ ان کی قبولیت قرآن یا عمل متواتر کے موافق ہونے کی وجہ سے ہو گی۔

احکام کے استنباط میں صحابہ سے مشورے بھی لیتے اور بحثیں بھی کرتے تھے۔ صوبوں سے جو سوالات آتے ان میں بھی لوگوں سے استفسار کرتے اور بعض کا جواب مہینوں کی بحث و تمحیص کے بعد دیتے۔

یمن کے والی نے ایک مقتول کے مقدمہ میں جس کو دو شخصوں نے مل کر قتل کیا تھا ان کو لکھا کہ دونوں سے قصاص لیا جائے یا صرف ایک سے؟ وہ جواب میں متردد تھے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ فرض کیجئے چند آدمیوں نے مل کر ایک اونٹ چرایا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کاٹ کر بانٹ لئے۔ کیا آپ ان سب کے ہاتھ نہیں کاٹیں گے؟ بولے کہ کیوں نہیں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ بس یہی صورت یہاں ہے۔ دونوں قتل میں شریک ہیں۔ دونوں قصاص کے سزاوار۔ اب انہوں نے والی کو لکھا کہ دونوں کو قتل کر دو بلکہ صنعاء کے سارے باشندے اس قتل میں شریک ہوتے تو میں سب سے قصاص لینے کا حکم دیتا۔

اسی طرح شراب خواری کی سزا جو نہ کتاب میں ہے نہ سنت میں' جب متعین کرنی چاہی تو حضرت علیؓ نے رائے دی کہ اس پر مفتری کی حد جو قرآن میں ۸۰ کوڑے ہے قائم کرنی چاہیے۔ کیونکہ مدہوش ہذیان بکتا ہے اور ہذیان میں افترا بھی ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور یہی حد مقرر کر دی۔ وہ تفقہ میں علت حکم کی مصلحت کو بنیادی شے قرار دیتے تھے۔ اور تفریع میں اسی کا لحاظ رکھتے تھے۔ قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مولفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے۔ اب یہ دیکھنا کہ تالیف قلب کا صیغہ کہاں اور کب تک مناسب ہے' مرکز کے اختیار تمیزی پر ہے۔ رسول اللہؐ نے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو جو امراء قبائل تھے' ایک بار تالیف قلب کے لیے سو سو اونٹ دیئے تھے۔ پھر خلیفہ اول کے عہد میں ان دونوں نے آ کر کچھ زمینیں طلب کیں۔ انہوں نے ان کے نام لکھ دیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اس اراضی کو واپس لے لیا اور فرمایا کہ اللہ نے اسلام کو قوت دے کر اب تمہاری امداد سے اس کو بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ زمینیں ان کے حق داروں کو دی جائیں گی اور تم نہ مانو گے تو تلوار سے فیصلہ ہوگا۔

اسی طرح قرآن نے حکم دیا ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں' لیکن چور کا اطلاق کس کے اوپر ہوتا ہے اس کی تعیین قانون ساز جماعت پر چھوڑ دی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو جو قحط سالی میں بھوک سے مجبور ہو کر کھانے کے لیے کوئی چیز چرا لیتے تھے قطع ید کی سزا نہیں دی' کیونکہ ان کی رائے میں وہ چور نہیں تھے ایک بار حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک شخص کا اونٹ چرا کر کھا لیا۔ جب حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیے گئے تو اعتراف کیا۔ مگر علت وہی بھوک تھی۔ اس لیے ان کے ہاتھ نہیں کاٹے بلکہ حاطب کے بیٹے عبدالرحمٰن کو بلا کر کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ

ان غلاموں سے کام لیتے ہو اور ان کو کھانے کو نہیں دیتے ہو اگر یہ شکایت آئندہ میرے پاس آئی تو میں تم کو ایسی سزا دوں گا کہ یاد رکھو گے۔

## رائے کی اہمیت:

یہ مثالیں میں نے اس لیے بیان کیں کہ معلوم ہو جائے کہ خلفاء راشدین رائے کا استعمال کہاں اور کس طرح کرتے تھے اور ان کے نزدیک اس کی کس طرح اہمیت تھی۔ وہ خود سوچتے دوسروں سے مشورہ لیتے اور بحثیں بھی کرتے تھے چونکہ ہمارے عقیدہ میں یہ حضرات معصوم نہ تھے اس وجہ سے بعض بعض مسائل میں ہم کو ان کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً حضرت عمرؓ نے وراثت میں عول کا قاعدہ جاری کیا۔ جب ان کے سامنے فرائض کے ایسے مسائل پیش ہوئے جن میں مخرج ورثہ کے سہام معینہ سے کم تھا تو انہوں نے حضرت زیدؓ بن ثابت سے جو صحابہ میں فن وراثت کے سب سے بڑے ماہر تھے' مشورہ کیا' بالآخر بجز اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ مخرج کو بڑھا کر کمی جملہ ورثہ پر ڈال دی جائے۔ اسی کو عول کہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے:

زینب۔ مسئلہ۔ عول ۱۰

---

| شوہر | ماں | دو حقیقی بہنیں | دو اخیافی بہنیں |
|---|---|---|---|
| ۳ | ۱ | ۴ | ۲ |

بقول فقہاء اس صورت میں قرآن کی رو سے شوہر کا حصہ نصف ہے ماں کا ۱/۶' دو حقیقی بہنوں کا ۲/۳ اور دو اخیافی بہنوں کا ۱/۳ اس لیے مسئلہ ۶ سے ہوا' لیکن جب اس کو حصہ داروں میں تقسیم کیا تو مجموعہ ۱۰ ہو گیا۔ اب ہر ایک وارث کو ۶ میں سے جس قدر ملنا چاہیے تھا اس میں سے ملا اس طرح کمی تو پر نہ رسدی سے سب کے حصہ میں آ گئی مگر ہو گئی قرآن کی مخالفت۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ سوچ کر کہ کیا قرآن کا اتارنے والا پروردگار (نعوذ باللہ) حساب سے ناواقف ہے۔ آیات وراثت میں زیادہ غور کیا تو اصل حقیقت ان کے اوپر ظاہر ہو گئی کہ دو مختلف تقسیمیں ہیں۔ جن کو ایک کر دینے سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ ورنہ عول قرآن کے بالکل خلاف ہے یہاں تک کہ وہ اس پر مباہلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ زفر بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ

جب یہ مسئلہ آپ کی سمجھ میں آ گیا تھا تو آپ نے حضرت عمرؓ کو سمجھانے کی کوشش کیوں نہ کی؟ بولے کہ ان کے رعب سے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

کاش انہوں نے سمجھایا ہوتا ممکن تھا کہ حضرت عمرؓ مان جاتے۔ پھر نہ فقہ کے ائمہ اربعہ اس کو اختیار کرتے نہ آج تک یہ امت میں چلا آتا۔[1]

اسی طرح جد کی توریث میں بھی وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ بلکہ حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق زندگی بھر اسی میں مختلف فیصلے کرتے رہے۔

بعض روایات سے جو میرے نزدیک مشتبہ ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تین طلاقوں کو جو بہ یک وقت دی جائیں' طلاق بائنہ قرار دیا۔ یہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔

لیکن یہ اجتہادی غلطیاں ہیں جن سے کوئی مجتہد بچ نہیں سکتا۔ بے شک بعد والوں کا فریضہ تھا کہ تصحیح کرتے مگر انہوں نے تنقیدی نظر ڈالنے کی ہمت نہیں کی حالانکہ قرآن کا ایک حرف بھی اپنی جگہ قائم کرنا سب سے بڑی دماغی نعمت اور حق کی عبادت ہے۔

اجتہاد و تفریع مسائل میں صحابہ کرام میں حضرت علیؓ' زیدؓ بن ثابت' ابوموسیٰ اشعریؓ' ابیؓ بن کعبؓ اور معاذ بن جبل وغیرہ خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے۔ عہد فاروقی میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہو جانے کی وجہ سے سینکڑوں قسم کے جدید مہمات مسائل پیش آئے جن میں یہ حضرات خلیفہ کے اجتہاد میں مدد دیتے تھے یہ طرز عمل صالح تھا جس سے آئندہ قانون ساز جماعت بن جاتی' اگر استبداد نہ مسلط ہو جاتا۔

حضرت عمرؓ نہ صرف شرعی بلکہ اقتصادی اور عمرانی امور میں بھی رائے سے کام لیتے تھے انہیں کے شیدائی اور شاگرد خاص حضرت عبداللہ بن مسعود تھے جو عراق کے دینی معلم تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے فقہاء جن کی امامت ابوحنیفہؒ پر منتہی ہوئی اصحاب رائے کہے گئے ابوحنیفہؒ حماد کے شاگرد تھے' اور حماد ابراہیم نخعی کے۔ نخعی نے علقمہ سے اخذ کیا جو ابن مسعود کے تلمیذ خاص تھے۔

---

[1] اس مسئلہ کو دلیل اور تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب الوراثت فی الاسلام میں جو عربی زبان میں ہے لکھ دیا ہے۔

## مذاہب اربعہ:

فقہ میں اہل سنت کے چار مذاہب مشہور ہیں۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی لیکن علمی لحاظ سے نظر ڈالی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صرف دو ہی مذاہب ہیں اصحاب رائے و اصحاب حدیث چنانچہ شہرستانی نے ملل و نحل میں یہی لکھا ہے ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کو اصحاب رائے قرار دیا ہے اور بقیہ مذاہب کے لوگوں کو اصحاب حدیث۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جب دینی لامرکزیت پیدا ہوگئی، اس وقت مدینہ میں محتاط صحابہ کی جماعت صرف حدیثوں پر عمل کرنے لگی۔ اکثر تابعین بھی اسی خیال کے ہوئے ان کو جس مسئلہ میں کوئی آیت یا روایت نہ ملتی، خاموش رہتے اور رائے کو مکروہ سمجھتے۔ سالم بن عبداللہ بن عمر سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا۔ فرمایا کہ اس بارے میں مجھے کوئی حدیث نہیں پہنچی ہے اس نے کہا کہ اپنی رائے سے جواب دے دیجئے۔ بولے کہ ممکن ہے کل وہ رائے بدل جائے پھر میں تمہیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ سے ان کے بیٹے عبداللہ نے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ ہو جہاں اصحاب رائے ہوں، لیکن کوئی ایسا محدث نہ ہو جو رطب و یابس میں تمیز کر سکتا ہو تو کیا کرے۔ بولے کہ محدث ہی کے پاس جائے اور اصحاب رائے سے نہ پوچھے۔ ضعیف حدیث بھی رائے سے بہتر ہے۔

اس طرح یہ لوگ رائے سے تو بچے رہے لیکن ضرورتوں کو کیسے روکتے؟ اس کا بلا ارادہ نتیجہ یہ ہوا کہ حدیثیں بنائی گئیں اور اس کثرت سے کہ پھر رائے کی حاجت بہت کم رہ گئی۔ مدینہ کہ امام مالک بن انسؒ تھے۔ ان کے شاگرد تھے شافعیؒ اور شافعیؒ سے احمد بن حنبلؒ نے اخذ کیا۔ اس طرح یہ تینوں مذاہب تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، امام مالکؒ اور شافعیؒ بھی رائے اور قیاس کو استعمال کرتے تھے لیکن واقعات میں، مفروضات میں نہیں اور نہایت احتیاط کے ساتھ۔ بشرطیکہ مبنیٰ کوئی مستند روایت ہو اور حنبلی مذہب کی بنیاد تو تمام تر حدیث پر ہی ہے غالباً یہی وجہ ہوئی کہ امام اوزاعی اور داؤد ظاہری کے مذاہب جو اسی نوعیت کے تھے اسی میں جذب ہو کر رہ گئے۔

عراقی مذہب کے بھی ایک بڑے رکن امام محمد نے امام مالکؒ کی شاگردی کی تھی لیکن یہاں تفریع

مسائل کے جو اصول ابراہیم نخعی کے زمانہ سے بن چکے تھے۔ ان کے مطابق رائے کا استعمال برابر جاری رہا اس وجہ سے فقہاء کے دو نمایاں گروہ ہو گئے۔ اصحاب حدیث و اصحاب رائے جن میں باہم اختلافات بھی تھے اور مخالفت بھی۔

## عراقی فقہ:

عراقی فقیہوں کی جماعت اپنے قاعدوں کے مطابق قیاس کو آزادی کے ساتھ استعمال کرتی تھی یہی وجہ ہوئی کہ ان میں اختلافات کی بہت کثرت ہو گئی۔ حجازی فقیہوں میں اختلافات ہیں مگر کم۔ بلکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ میں بھی اس قدر اختلافات نہ ہوں گے' جس قدر کہ خود فقہاء عراق میں ہیں۔ جس کی وجوہ یہ ہیں:

۱۔ قیاسات کا مدار فکر پر ہے اور سب کا طریق فکر نہ ایک تھا نہ ایک ہو سکتا تھا۔ چنانچہ خود صاحبین میں یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد میں جو ایک ہی استاد کے شاگرد اور ایک ہی طریق فکر و اصول کے پیرو ہیں' بے شمار اختلافات ہیں۔

۲۔ یہ لوگ مفروضات میں گھس جاتے تھے یعنی ہر ایک مسئلہ کی جتنی خیالی شکلیں ہو سکتی تھیں سب کو معرض بحث میں لاتے تھے' جن کے جوابات مختلف ہوتے تھے۔ ایک مسئلہ کا حکم نکالتے' پھر استاد سے کہتے "ارایت لو کان کذا" (دیکھئے تو اگر صورت یہ ہو) اس کے بعد اس صورت کو حل کرتے۔ اصحاب حدیث اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ امام شعبیؒ نے کہا کہ ان لوگوں سے مجھے اس قدر نفرت ہے کہ مسجد میں آتے ہوئے کوفت ہوتی ہے۔ کسی نے پوچھا کن لوگوں سے؟ بولے ان "ارائیتیوں سے۔"

امام مالک کی محفل بہت باوقار تھی۔ ان سے کسی کو سوال کرنے کی جرات بہت مشکل سے ہوتی تھی۔ اسد بن الفرات نے ایک بار کوئی سوال کیا۔ امام موصوف نے اس کا جواب دے دیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ اگر شکل یہ ہو۔ بولے یہ سلسلہ بنت سلسلہ ہے اگر اس کے خواہش مند ہو تو عراق چلے جاؤ۔

اس زمانہ میں حدیث کا غلبہ اس قدر تھا کہ بلا روایتی سند کے کسی کے قول' استنباط یا اجتہاد کی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہوئی کہ عراقی فقہاء بھی مسائل میں اپنی رایوں کی تائید کے لیے

حدیثیں پیش کرنے پر مجبور ہوئے' مگر ان کی بہت سی روایتیں ایسی ہیں جن کی زبان تک بھی محدثانہ نہیں' بلکہ فقیہانہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف بغداد کے قاضی القضاۃ ہو گئے تھے' انہوں نے اپنی قابلیت سے فقہ حنفی کو دولت عباسیہ کا رسمی قانون بنا دیا جس کے باعث اس میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ اور مدت دراز تک مشرقی ممالک میں اسلامی مدنیت کا ساتھ دیتی رہی۔ علامہ ابن خلدون نے افریقہ اور اندلس میں مالکی مذہب کے پھیلنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ ان ممالک میں بداوت تھی اور ان کے باشندے اس تہذیب سے جو عراق میں تھی' ناآشنا تھے اس وجہ سے مالکی مذہب جو سادہ اور ان کی طبائع کے مناسب حال تھا ان میں مقبول ہوا۔

اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ امام جس شہر کا ہوتا ہے اس کی بداوت اور حصارت کا اثر نہ صرف اس کی فقہ پر بلکہ اس کی رائے کی تکوین پر بھی پڑتا ہے حالانکہ فقہ کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے جو مقامی اثر سے بالاتر ہے۔ بے شک حنفی فقہ میں بعض بعض مسائل میں وسعت اور رخصت نظر آتی ہے مثلاً وہ نماز کو فارسی میں بھی پڑھنے کی اجازت دیتی ہے اور قرآن کی تلاوت کو دوسری زبانوں میں بھی مباح کرتی ہے اسی طرح عاقل وبالغ عورت کو بلا ولی کے نکاح کا اختیار دیتی ہے۔ اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ ان امور کو روا نہیں رکھتے' مگر اسی کے ساتھ اس میں کہیں کہیں تنگی اور سختی بھی ہے۔ مثلاً اس میں نکاح کے معاملہ میں کفالت کا اعتبار کیا گیا ہے کہ قریش فلاں قبیلہ کے کفو ہیں اور عجمی نومسلم عرب کے کفو نہیں ہیں۔ اس کفائت کے مسئلہ نے اسلامی برادری کی وسعت کو مٹا دیا اور اس کی اشاعت میں رکاوٹ کا موجب ہوئی۔ بہت سے گھرانے آسانی سے اسلام لانے کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں اگر ان کو یقین ہو جائے کہ ان کی بیٹیاں اچھے گھروں میں جا سکیں گی۔ بخلاف اس کے حجازی فقہ میں سارے کلمہ گو ہم کفو تسلیم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح حنفی فقہ نے عورتوں کے حق خلع کو ضبط کر لیا۔ جس کے نتائج ہند میں ہمارے سامنے ہیں کہ مسلمان بیویاں اپنے شوہروں کے مظالم سے بعض وقت تنگ آ کر جب رہائی کی کوئی صورت نہیں دیکھتیں تو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس لیے علامہ موصوف کی یہ رائے فقہوں کے تقابلی مطالعہ پر نہیں بلکہ محض قیاس پر مبنی ہے۔ بے شک امام ابوحنیفہؒ کے اقوال عام طور پر قرآن سے مطابق ہیں۔ حنفی فقہ سے ان کو نکال لینے کے بعد اس کا بقیہ حصہ سب فقہوں سے زیادہ ترمیم کے قابل ہے۔

متاخرین فقہاء حنفیہ نے تو خیالی تفریقوں اور قانونی موشگافیوں میں اس قدر غلو کیا ہے کہ ابواب نکاح وطلاق میں ان کی لفظی بحثیں عقل وعلم کی حد سے آگے بڑھ گئی ہیں۔ اور کتاب الحیل جس میں نہ صرف ضمیر کو دھوکا دینے بلکہ شرعی قوانین کو بے کار کرنے کی کوشش کی گئی ہے تقویٰ کے خلاف ہے۔[1]

## تقلید:

ہر صاحب نظر اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ قانون سازی کا حق صرف مرکزی جماعت کو ہے۔ اسی کا بنایا ہوا قانون پوری امت کا قانون ہوتا ہے لیکن خلافت راشدہ کے بعد جب امت کی دینی مرکزیت جاری رہی تو اس مذہبی انفرادیت میں علماء نے شخصی فقہیں مرتب کیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا خلوص اور تقویٰ کے ساتھ کیا۔ ان کی شخصیتیں اس قدر محترم تھیں کہ خلفاء کو جب تک کہ ان کی سیاست پر زد نہ پڑتی ہو کبھی ان کے مسائل میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ امام مالک کو جو مجبور کی طلاق کو ناجائز کہتے تھے۔ عباسی خلیفہ نے کوڑوں سے پٹوایا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ مسئلہ غلط تھا بلکہ اس سے مجبور کی بیعت خلافت ناجائز قرار پاتی تھی۔

ان فقہاء کرام کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ ان کی بنائی ہوئی فقہوں کو الگ الگ مذہب بنالیں اس لیے ان کے بعد کے علماء کا فریضہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا پیشوا مان کر ان کے اجتہادوں میں امتزاج پیدا کرتے اور سب کی فقہوں کو ملا کر ایک فقہ بنا لیتے لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ ہر فقہ کے پیروؤں نے رفتہ رفتہ اسی کو اپنا مذہب بنالیا اور دوسرے ائمہ کی فقہوں کو چھوڑ دیا۔ اس تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت میں تفریق اور نزاع بڑھتی گئی۔ بالآخر یہ طے کیا گیا کہ چاروں مذاہب حق ہیں مگر اس کا مفہوم یہ رکھا گیا کہ حنفی مذہب حنفیوں کے لیے اور شافعی مذہب شافعیوں کے لیے حق ہے ایک کو دوسرے کی فقہ کے مطابق فتویٰ دینا روا نہیں۔ اس سے نزاع تو کم ہوگئی مگر تفریق بدستور باقی رہی جو آج تک قائم ہے۔ ہر ہر فرقہ کے امام الگ ہیں، علماء الگ ہیں، کتابیں الگ ہیں، گویا ہر فقہ ایک مستقل مذہب ہے اور ہر ایک کے پیرو ایک مستقل امت یہاں تک کہ خانہ کعبہ میں چار مصلے بھی الگ الگ تعمیر کیے گئے جو امت کی مذہبی تفریق کے مظاہر ہیں اور جن کو دیکھ کر ہر صاحب بصیرت اور دردمند مسلمان کو قلق ہوتا ہے۔

---

[1] اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو علامہ ابن القیم کی کتاب اعلام الموقعین کا مطالعہ کیجئے جو دو ضخیم جلدوں میں اسی عنوان پر ہے۔

## شیعی فقہ:

شیعی حدیث وفقہ کا بڑا مرجع امام جعفر صادق کی ذات ہے بلکہ انہیں کی نسبت سے یہ مذہب جعفری کہا جاتا ہے۔ وہ نہ اجماع کو صحیح سمجھتے تھے نہ قیاس کو اس لیے اس فقہ کا تمام تر دار و مدار کتاب وسنت پر ہے۔ چونکہ شیعوں کی حدیث اپنے ائمہ کے متعلق مخصوص عقائد رکھنے کی وجہ سے سنیوں سے مختلف ہے اس وجہ سے ان کی فقہ بھی الگ ہوگئی۔

یوں تو فریقین کے اختلافی مسائل بہت ہیں جن کا شمار مشکل ہے لیکن تین مسئلوں میں اہل سنت سے الگ ہوکر شیعوں نے اپنے فرقہ کا امتیاز قائم کیا ہے:

۱۔ وضو میں پاؤں کو دھونے کے بجائے ان پر مسح کرتے ہیں۔

۲۔ اذان میں **حی علی الفلاح** کے بعد **حی علی خیر العمل** پکارتے ہیں۔

۳۔ متعہ کو جائز سمجھتے ہیں جو سنیوں کے یہاں شروع سے بالاتفاق حرام ہے۔

متعہ یہ ہے کہ ایک معین مہر پر معین مدت کے لیے نکاح کیا جائے۔ اس میں نہ تعداد کی حد ہے نہ گواہ کی ضرورت، نہ وراثت ہے نہ طلاق، مدت گزر جانے پر نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ کافی میں ایک روایت ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی نے امام باقی سے متعہ کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کو اللہ نے اپنی کتاب میں اور نبی نے اپنی سنت میں حلال کیا ہے اور وہ قیامت تک حلال ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ آپ یہ فرماتے ہیں اور حضرت عمرؓ تو اس کو حرام جانتے تھے بولے کہ ان کا قول باطل تھا، میں رسول اللہؐ کے قول پر ہوں جو حق ہے۔ عبداللہ لیثی نے کہا کہ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی بہنیں اور بیٹیاں متعہ کرائیں۔ یہ سن کر انہوں نے منہ پھیر لیا اور کچھ نہیں کہا۔

شیعہ نے بھی کوشش کی کہ خانہ کعبہ میں ایک مصلی مذہب جعفری کا قائم ہو جائے۔ نادر شاہ ایرانی سالہا سال تک سلاطین عثمانیہ کو لکھتا رہا، مگر سلطان محمود خان عثمانی اور ترکی کے شیخ الاسلام نے نہ مذہب جعفری کی صحت تسلیم کی، نہ کعبہ میں اس کا مصلی منظور کیا۔